نقوشِ راہ دکھاتے چلو زمانے کو
قدم قدم پر مسافر پریشان بیٹھے ہیں

ماہ نامہ

نقوشِ راہ

November 2021

- حق و باطل کی کشمکش کا ادراک
- مسلم معاشرے میں کفالت کا ناپید ہوتا تصور
- امریکہ، طالبان اور عورتوں کے حقوق
- آزادی کے وہم میں گھرا تیونس

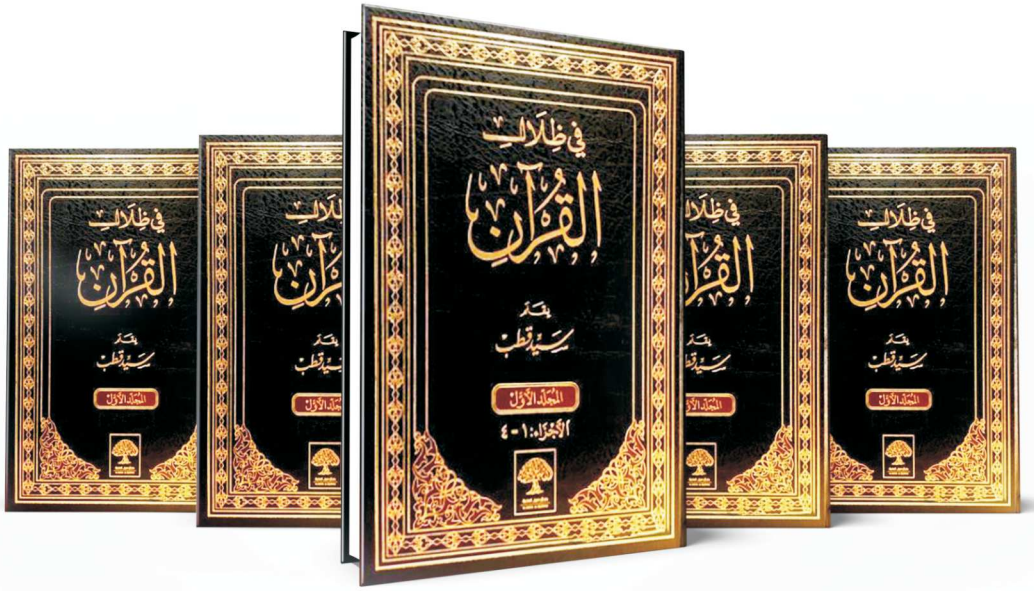

فی ظلال القرآن

مصری عالم دین سید قطبؒ شہید کے ذریعہ زنداں (جیل) میں لکھی جانے والی عربی زبان کی مایاناز تفسیر
کی اردو ترجمانی اپنی اصل روح کے ساتھ بذریعہ مولانا سید حامد علیؒ صاحب / مولانا مسیح الزماں فلاحی ندوی صاحب

اب ان شاء اللہ بہت جلد صرف 10 یا 11 جلدوں میں مزید آرائش و زیبائش کے ساتھ

- شُستہ ، شگفتہ اور عام فہم زبان میں اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر
- علمی ، فکری اور سائنٹفک تفسیر- دعوتی تربیتی اور انقلابی تفسیر- وجدانی اور ادبی تفسیر
- کسی قسم کی الجھن اور پیچیدگی کے بغیر مفاہیم قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کیلئے بہترین تفسیر
- اسلامی اجتماعیت کے اصول، طریق کار اور عروج و زوال کے اسباب پر سیر حاصل گفتگو
- اسلامی جماعت کے کارکنان کیلئے بہترین مشعل راہ
- عمدہ کاغذ، بہترین کتابت و طباعت اور پر کشش ٹائٹل

اس انقلاب انگیز تفسیر کا مکمل سیٹ اپنی لائبریری، مسجد اور گھر کیلئے ضرور منگائیں۔

ORDER NOW

اپنا آرڈر بک کرائیں

موبائل 9599693655
ای میل gpddelhi2018@gmail.com

ایمان لانے والوں کا کارساز اللہ تعالیٰ خود ہے، وہ انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے۔ (القرآن)

ماہنامہ

نقوشِ راہ

Islamic Youth Federation

اسلامک یوتھ فیڈریشن (IYF) کا ترجمان

جلد:04 شمارہ:8

نومبر 2021ء، ربیع الاوّل/ ربیع الثانی ۱۴۴۳ھ

فہرست مضامین

اداریہ	منہاج الاسلام فلاحی	04
درسِ قرآن	عبید الرحمٰن ابوحذیفہ	05
درسِ حدیث	خبیب احسن فلاحی	07
حق و باطل کی کشمکش کا ادراک	اسامہ عظیم فلاحی	09
تجربات زندگی کا نچوڑ	عبدالماجد دریابادیؒ	14
مسلم معاشرے میں کفالت کا ناپید ہوتا تصور	پرویز نادر	16
ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی	مختار احمد مکی	20
ولاء اور براء: محبت اور نفرت کا اسلامی فلسفہ	ابوصدف مدنی	24
امریکہ، طالبان اور عورتوں کے حقوق	ابوحذیفہ جاوید	30
آزادی کے وہم میں گھرا تیونس	حافظ محمد عبداللہ	32
گوشۂ خواتین: خواتین اور غیرت مسلم	مریم جمیلہ فلاحی	35
بک ریویو: اسلامی سیاست	مبصر: ابوالفیض اعظمی	37
گوشۂ اطفال: سیرت النبیؐ: چیدہ چیدہ واقعات	مرزا اسلم	40
اقبالیات: خطاب بہ جوانانِ اسلام	شیر خالد	42

چیف ایڈیٹر
معاذ احمد جاوید

ایڈیٹر
ڈاکٹر محمد مبشر

معاون ایڈیٹر
اُسامہ عظیم فلاحی

مجلس ادارت
- پرویز نادر
- فیض الرحمٰن
- حذیفہ احمد جاوید
- صابر محفوظ فلاحی

سرکولیشن منیجر
پرویز نادر

زرتعاون

فی شمارہ:-/20

سالانہ:-/220

Current A/c Name: Nukush E Rah
A/c No : 9650 2011 0000 482
Bank of India - Akola Branch
IFSC : BKID0009650

Printer, Publisher and Owned by Shaikh Nisar Shaikh Chand Printerd at Super Printing Press, Telipur Chowk, Akola, Published at 1st Floor, Opposite Basera Aprartment, Subhash Chowk, Akola.-444001
Editor: Shaikh Nisar Shaikh Chand

اداریہ

''کھسیانی بلی کھمبا نوچے''، یہ ضرب المثل آپ نے ضرور سنی ہوگی لیکن کبھی کسی ایسی بلّی کو دیکھا نہ ہوگا۔ دیکھا تو خیر میں نے بھی نہیں ہے لیکن بھارت کی موجودہ برہمنی سرکار میں آپ اس بلّی کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ ۲۰۱۴ء میں جب بلّی کے بھاگ سے چھینکا ٹوٹا تو تقریباً ایک صدی کی مسلسل جدوجہد اور تمام طرح کے سرکاری وغیر سرکاری وسائل کے مسلسل استعمال کے بعد آر۔ایس۔ایس کے نظریہ پر مبنی سرکار مکمل اکثریت کے ساتھ اقتدار میں آئی۔اس اقتدار کی سربراہی ایک ایسے فرد کو دی گئی جسکے دونوں ہاتھ مسلمانوں کے خون سے آلودہ ہیں۔آر۔ایس۔ایس ہندو قوم کے اس طبقے کی نمائندگی کرتی ہے جو یہودیوں کی طرح خود کو دنیا کی دوسری اقوام سے برتر و اعلیٰ تصور کرتا ہے۔

لہٰذا یہودیوں کی طرح اس کی دشمنی بھی براہ راست اسلام اور مسلمانوں سے ہی ہے۔جب یہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھے، مسلم ممالک کے دورے کئے، وہاں کی تہذیب وتمدن، اخلاق و کردار، دولت ومعدنیات اور مختلف طرح کے وسائل کی فراوانی کا مشاہدہ کیا تو انھیں محسوس ہوا کہ اب تک وہ ایک کنوئیں میں تھے اور اسے ہی پوری کائنات سمجھ کر ٹرٹر کر رہے تھے۔انہوں نے یہ محسوس کیا کہ جس مسلم قوم کو وہ بھارت میں اقلیت کہتے ہیں وہ تو عالمی منظر نامے میں اکثریت میں ہیں۔ جس مسلم دشمنی کی بنا پر وہ اقتدار میں آئے اس مسلم قوم کے 57 ممالک دنیا میں موجود ہیں۔اس طرح وہ بحیثیت قوم عالمی منظر نامے میں خود ہی اقلیت میں ہیں۔اس حقیقت کے ادراک نے انہیں شدید طور پر احساس کمتری کی نفسیات میں مبتلا کر دیا۔انہیں آج شدت سے یہ احساس ستانے لگا کہ دنیا کی بدلتی ہوئی صورتحال میں ان کی برہمنی تنگ نظری بالکل بھی قائم نہیں رہ سکتی۔احساس کمتری کی اس نفسیات نے انہیں شدید قسم کے خوف میں مبتلا کر دیا اور وہ یہ محسوس کرنے لگے بھارت میں مسلمانوں کا وجود اب ان کی تہذیب، تمدن وتاریخی روایات کے لئے ایک چیلنج ہے۔

پھر انہوں نے یہ پالیسی بنائی کہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے اچھے تعلقات رکھے جائیں اور بھارت کے مسلمانوں کو خوف ودہشت کی نفسیات میں اس قدر مبتلا کر دیا جائے کہ وہ ان کی ظالمانہ مذہبی، تہذیبی وتمدنی روایات کے لئے کوئی چیلنج نہ بن سکیں۔اس احساس کمتری کو ''ہندو رکھشا'' کا نام دے کر انھوں نے اپنی پوری قوم میں بھر دیا۔گھر واپسی، رام مندر کے حق میں فیصلہ، یعقوب میمن کی شہادت، موب لنچنگ، سی اے اے، این آر سی، مبلغین اسلام کی گرفتاری وغیرہ اسی نفسیاتی احساس کمتری کے ذریعہ پیدا ہونے والے خوف کا ردعمل ہے۔اس نفسیاتی خوف میں اب دھیرے دھیرے سیکولر و روادار ہندو بھی مبتلا ہو رہے ہیں۔

یہ اسلام اور مسلمانوں سے اتنے خوفزدہ ہیں کہ انھیں چین کا خطرہ کم محسوس ہو رہا ہے۔چین بھارت کے کچھ علاقے میں نہ صرف یہ کہ گھس آیا ہے بلکہ کیمپ لگا کر جم گیا ہے۔لیکن ان سب کے باوجود سب خاموش ہیں۔آخر کیوں؟ وہ اس لئے کہ چین سے بھارت کی سرزمین کو خطرہ ہے اور مسلمانوں سے ان کی ظالمانہ تہذیبی وتمدنی روایات کو خطرہ ہے اور ان کے نزدیک ان کی یہ مذہبی روایات ملک پر فوقیت رکھتی ہیں۔اس کے لئے ملک کو قربان کیا جا سکتا ہے۔اسی لئے وہ چین کو تو نظر انداز کر رہے ہیں لیکن ملک میں مسلم مبلغین کو گرفتار کر رہے ہیں، اذان، نماز، مساجد، مذہبی جلسے جلوس پر پولیس کی سرپرستی میں حملے کروا رہے ہیں۔بھارت کے مسلمانوں کو اس سنگینی حالت کا احساس ہونا چاہئے۔اور ان حالات سے نکلنے کی منصوبہ بند کوشش کرنی چاہئے۔

مسلمانوں کا اکثریتی طبقہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ بی جے پی کے شکست کھا جانے اور کانگریس یا کسی دوسری سیکولر پارٹی کے اقتدار میں آجانے کے بعد حالات سدھر جائیں گے۔ایسا سوچنے والے سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ یہ سیکولر ڈیموکریسی سسٹم کا ہی نتیجہ ہے کہ امت مسلمہ اس حال کو پہنچی ہے۔سیکولر ڈیموکریٹک سسٹم جو حقوق اقلیت کو دیتا ہے اس کی حیثیت اس میٹھے خواب آور دوا کی سی ہوتی ہے جو اقلیتوں کو مزید غفلت کی نیند سلا دیتی ہے اور جب کبھی وہ بے ہوشی سے تھوڑا بیدار ہوتا ہے تو اپنی گردن میں ایک اور نئی زنجیر دیکھتا ہے۔علامہ اقبال نے سیکولر ڈیموکریسی کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہوئے یہ فرمایا۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

جن حالات سے ہم اس ملک میں گزر رہے ہیں ہمیں چاہئے کہ ہم حکمراں کی تبدیلی کے بجائے اپنے معاشرتی، معاشی، تعلیمی تبدیلی کی منصوبہ بندی کریں اور یہ بات اچھی طرح جان لیں کہ کھسیانی بلی کھمبا نوچتے ہی متحرک چھڑی و ڈنڈے کو دیکھ کر بڑی تیز بھاگتی ہے۔

(منہاج الاسلام فلاحی)

درسِ قرآن

عبید الرحمٰن ابو حذیفہ

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

استقامت

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ● وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (ھود: ۱۱۲۔۱۱۳)

ترجمہ: پس اے محمدؐ تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و اطاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہِ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔

سورہ ھود مکی سورہ ہے۔

مرکزی مضمون:

(۱) رسول جو دعوت پیش کر رہا ہے اس سے انکار تمہارے لیے خسارہ ہے۔

(۲) اس سورہ میں مخالفین کو پُر زور طریقے سے رسول کے انکار پر تنبیہ کی گئی ہے۔

پچھلی آیتوں کا مختصر خلاصہ:

جن لوگوں نے نبی کی تعلیمات کو جھٹلایا اور مذاق اڑایا ان کا انجام دنیا والوں کے سامنے ہے۔ مخالفین جن معبودوں کی عبادت کر رہے ہیں وہ انھیں ہرگز کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔ نبی کی لائی ہوئی شریعت سے انحراف میں رسوائی ہی رسوائی ہے۔ جن لوگوں نے انبیاء و رسل کی پکار پر لبیک کہا اللہ نے ان کے مرتبہ کو بلند فرمادیا اور ان کے لیے شاندار محلوں کو تیار کر رکھا ہے۔

فَاسْتَقِمْ ..... مَعَكَ

اس آیت میں استقامت پر زور دیا گیا ہے۔ استقامت کے معنیٰ سیدھا کھڑا ہونا جس میں کسی طرف ذرہ برابر بھی جھکاؤ نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کے مقابلہ میں کسی طرح کا Compromise نہیں۔ اپنے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق اور معاشرت وغیرہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق انجام دیے جائیں۔ کسی مفاد کے تحت دین کو بازیچہ اطفال ہرگز نہ بنایا جائے اور ہر حال میں زندگی شریعت کے مطابق گزاری جائے۔ استقامت نفس دشمن کے مقابلہ میں بہت بڑا ہتھیار ہے۔ اس کی پابندی نفس پر بہت شاق گزرتی ہے۔ دنیا کی رنگینیاں اور دشمن کا خوف ہر وقت اس کے راستے میں آتے ہیں لیکن استقامت ایک ایسا ہتھیار ہے جو ان تمام چالوں کو ناکام بنا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدد فرماتا ہے جو اس عظیم راستے پر چلتے ہیں۔ ایک صحابی سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ نے رسولؐ سے عرض کیا کہ مجھے اسلام کے معاملے میں کوئی ایسی جامع بات بتلا دیجیے کہ آپؐ کے بعد مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ آپؐ نے فرمایا: قل آمنت باللہ فاستقم۔ (اعلان کرو کہ میں ایمان لایا اور پھر اس پر جم جاؤ) سورہ آل عمران کی آیت ۱۴۲ کے تحت سید قطب شہید لکھتے ہیں کہ:

''جہاد سے زیادہ اہم صبر و استقامت ہے۔ یعنی اتنی بات کافی نہیں ہے کہ اہل ایمان جہاد کریں، دعوت حق کی تکلیف پر صبر بھی ضروری ہے۔ مسلسل، مستمر اور متنوع تکالیف پر، جو میدان کے جہاد تک محدود نہیں ہیں، صبر۔ بسا اوقات دعوت حق کی تکالیف سے میدان کا جہاد نسبتاً ہلکی تکلیف کا درجہ رکھتا ہے! یہ تو روزانہ مشقتوں کو جھیلنے کا سلسلہ ہے، جو ختم نہیں ہوتا! پھر ایمان کے افق

پر استقامت کی مشقت ہے! فکر و عمل اور زندگی کے رویے میں ایمان کے مقتضیات پر قائم رہنا اور پھر اسی دوران اپنی ذات اور دوسرے لوگوں کے سلسلے میں انسانی کمزوری پر صبر! ان اوقات میں صبر جبکہ وہ غالب و سربلند ہوجاتا ہے اور ایک فاتح کی طرح اپنا زور دکھاتا ہے! راہ حق کی درازی و دشواری اور موانع کی کثرت پر صبر! جدوجہد، کرب و بلا اور جنگ کی زحمتوں کے مقابلے میں راحت و آرام کی طرف رغبت اور اس کے لئے نفس کے اشتیاق کے مقابلے میں صبر! اور یہ صبر اس راستے پر چلنے کے دوران ہے، جو مصائب و شدائد سے ڈھکا ہوا ہے یعنی جنت کا راستہ! وہ جنت جو آرزوؤں اور لفظی جمع خرچ سے حاصل نہیں ہوتی! (جہاد اور صبر و استقامت سے حاصل ہوتی ہے)''

وَلَا تَطْغَوْا ..... بَصِيْرٌ

حالات سے مرعوب ہو کر دنیاوی نقصانات سے ڈر کر تم کو یہ حق ہی نہیں کہ اللہ سے سرکشی اور بغاوت کرو اور جو اللہ کا حق ہے وہ کسی اور کو دو۔ اور یہ بات ذہن میں رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے جیسا تم کرو گے ویسا ہی تم کو بدلہ دیا جائے گا۔

بصیر کا لفظ یہاں برمحل ہے۔ اس سے مراد وہ ذات ہے جو ہر چیز بڑی باریکی اور گہرائی سے دیکھ رہی ہے اور جس کے حیطۂ ادراک سے کوئی چیز چھوٹی نہیں رہ سکتی۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا ..... تُنْصَرُوْنَ

اس آیت میں ایمان لانے والوں کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ خوف و طمع یا دنیاوی زندگی کے فرسودہ مقاصد کے لیے ان لوگوں کی طرف ہرگز نہ مائل ہوجانا جنھوں نے شرک کا ارتکاب کیا ہے اور جو تمہارے دین اور وجود کے دشمن ہیں۔ تمہارا سب سے بڑا خسارہ ہوگا کہ تم دنیا کے تھوڑے سے فائدہ کے تحت ان لوگوں کو اپنا حامی اور مددگار اور اپنے دلوں میں ان کے تعلق سے نرمی رکھو جو اللہ کے دین کو مٹانے کی بھرپور کوشش کرنے میں لگے ہیں۔ اگر تم نے اس (دین کے دشمن سے ہاتھ ملایا) چیز کا ارتکاب کیا تو تمہارا بھی انجام ویسا ہوگا جیسا انجام دین کے دشمنوں کا ہوگا۔ سورہ ممتحنہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ (الممتحنة: ۱)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم اُن کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اُس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں اور اُن کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب، اللہ پر ایمان لائے ہو۔''

اور دوسری آیت میں فرماتا ہے کہ:

لَّا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنة: ۸)

''اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

مندرجہ بالا تین آیتوں کو دیکھ کر یہ پتا چلتا ہے کہ جو ہمارے دین اور وجود کے دشمن ہیں اگر ہم ان کی طرف دوستی کی غرض سے مائل ہوتے ہیں تو آخرت میں ہمارے لیے بھی دردناک عذاب ہے کیونکہ وہ یہ چاہیں گے کہ ہم بھی کفر کریں۔ اس کے برخلاف وہ لوگ جو نہ ہمارے دین کے دشمن ہیں اور نہ جن سے ہمارے وجود کو خطرہ ہے تو ہم ان کے ساتھ ہمدردی اور احسان کا سلوک کریں لیکن ایسا نہ ہو کہ ہمدردی میں اس قدر غلو کریں کی اللہ کی ہی نافرمانی ہونے لگے۔

●●●

اعلان برائے اشتہار و تعاون

نقوش راہ کو مالی تعاون درکار ہے جس کے لیے آپ اپنے اشتہارات اور مالی تعاون دے سکتے ہیں۔ تفصیلات کے لئے درج ذیل نمبر پر رابطہ کریں۔

+919156564239

درسِ حدیث

خبیب احسن فلاحی

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

عَنْ تَمِیم بنِ أَوْس الدَّارِی رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ، قَالَ: اَلدِّیْنُ النَّصِیحَۃُ ، قُلْنَا لِمَنْ؟ قَالَ : لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِأَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ (بخاری)

ترجمہ: ''حضرت تمیم داریؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: دین سراسر خیر خواہی کا نام ہے۔ ہم صحابہؓ نے پوچھا خیر خواہی کس کے لیے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ رب العزت کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے، مسلمانوں کے حکمرانوں اور عوام کے لیے۔''

مذکورہ بالا حدیث جوامع الکلم میں سے ہے۔ جوامع الکلم ان احادیث کو کہا جاتا ہے جو الفاظ کے اعتبار سے نہایت مختصر ہوں مگر معانی کا دریا ان کے اندر پنہاں ہو، جسے ہم محاورے میں دریا کو کوزے میں بند کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً نبی اکرمؐ نے دعا کے حوالہ سے فرمایا:

''اَلدُّعَاءُ ھُوَ الْعِبَادَۃ''

''دعا ہی عبادت ہے''

مزید آپؐ نے روزہ کے بارے میں فرمایا:

''اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ'' (روزہ ایک ڈھال ہے)

دیکھنے میں یہ تو صرف دو یا تین الفاظ کا مجموعہ ہے مگر ان میں معانی کا ایک دریا ہے، اسی طرح اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن کا شمار جوامع الکلم میں ہوتا ہے۔

امام نوویؒ مذکورہ حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث پورے دین کا خلاصہ ہے نیز حافظ ابن حجر اور علامہ یمینی کہتے ہیں کہ یہ حدیث تمام امور دین کو شامل ہے۔ نصیحۃ اللہ سے قرآن مجید کے احکام معلوم ہوتے ہیں اور ولرسولہ و لأئمۃ .....سے سنت نبوی اور معاشرتی امور معلوم ہوتے ہیں۔

'' اَلدِّیْنُ النَّصِیحَۃُ '' دین تو سراسر خیر خواہی کا نام ہے۔ نصیحت تو دراصل نصح سے ماخوذ ہے۔ خالص ہونے اور ہر قسم کی ملاوٹ اور شائبہ سے پاک ہونے کے آتے ہیں۔ العسل الناصح اصلی اور خالص شہد کو کہتے ہیں۔ اس طرح نصیحت کے معنی اخلاص اور وفاداری وغیرہ کے مستعمل ہونے لگے۔

''الدین النصیحۃ للہ'' اللہ رب العزت کے ساتھ خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ رب العزت کی ذات اور اس کی جملہ صفات پر صدق دل سے ایمان لائے، اللہ کی وحدانیت، ربوبیت اور حاکمیت وغیرہ کا اعتقاد رکھے نیز اس کی ذات وصفات میں کسی غیر کو شریک نہ کرے، اس کی عبادت اخلاص نیت کے ساتھ کرے، اس کے اوامر ونواہی کی اطاعت وفرمانبرداری کرے، اور اس کا شکر ادا کرے، انفرادی سطح پر اس کے تمام احکام پر عمل پیرا ہو اور اجتماعی سطح پر بھی اس کے جملہ قوانین کو نافذ کیا جائے۔

''لکتابہ'' اللہ کی کتاب کے ساتھ خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ سچے دل سے یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ کتاب منزل من اللہ (اللہ کی طرف سے نازل کردہ) ہے۔ اس کی تعلیمات پر مکمل طور پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے بایں طور کہ زندگی کا ہر لمحہ، ہر پل قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق ہو، زندگی کا کوئی بھی معاملہ ہو سب سے پہلے قرآن مجید کی ہدایات کی جانب رخ کیا جائے۔ اللہ کی کتاب کے ساتھ خیر خواہی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کی جائے اور اس پر غور وفکر کیا جائے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اس کی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت کی جائے اور جو بھی کفر و الحاد پر مبنی نظریات پائے جاتے ہیں قرآن مجید کے دلائل و براہین کے ذریعہ ان کا ابطال کیا جائے یہ ایک اہم فریضہ بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ:

و جاھدھم بہ جھاداً کبیراً (الفرقان: ۵۲)

''تم قرآن مجید کے ذریعہ بڑا جہاد کرو''

یعنی جو بھی باطل، گمراہ کن نظریات پھیلے ہوئے ہیں، قرآن مجید کی مدد سے ان کو زیر کیا جائے اور قرآن مجید کو غالب کیا جائے۔

''ولرسولہ'' اللہ کے رسولؐ کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ صدق دل سے یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ اللہ کی جانب سے بھیجے گئے رسول اور پیغمبر ہیں، ان کی نبوت اور رسالت پر ایمان لایا جائے اور ان کی مکمل اطاعت و پیروی کی جائے اور انہیں ہادی و رہ نما کے ساتھ ساتھ خاتم الانبیاء تسلیم کیا جائے۔

''وَمَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا'' (الحشر:۷)

''اور جو کچھ رسول تمھیں دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں اسے باز آجاؤ''

رسول کے ساتھ خیر خواہی کا ایک اور تقاضا یہ بھی ہے کہ ان کو اپنی جان اپنی اولاد اپنے ماں باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز رکھا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ''

''نبی تو مومنوں کے لیے ان کی اپنی ذات سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔''

''ولأئمة المسلمين'' مسلمانوں کے اماموں کے ساتھ خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلامی سلطنت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہو اس کے ساتھ بھی خیر خواہی اور وفاداری برتی جائے۔ و اولی الأمر منکم کے تحت معروف میں ان کی اطاعت کی جائے اور معصیت میں ان کی اطاعت سے اجتناب کیا جائے، اگر وہ دین اسلام اور اپنی رعایا کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت کا شکار ہوں تو ان کو مناسب انداز میں متنبہ کیا جائے، نیز امور مملکت کے سلسلے میں بہتر سے بہتر مشورے دیئے جائیں تاکہ وہ بحسن وخوبی حکومت کے فرائض انجام دے سکیں۔

''وعامتهم'' عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ لوگوں کی بھلائی و بہتری پیش نظر رکھی جائے، ان کو کسی بھی طرح کی تکلیف پہنچانے کے بجائے نفع پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو بھی حقوق عائد ہوتے ہیں ان کو ہر حال میں ادا کیا جائے۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا:

حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ: إِذَا لَقِيتَهُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ وَإِذَا دَعَاكَ فَأَجِبْهُ وَإِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانْصَحْ لَهُ وَإِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللهَ فَشَمِّتْهُ وَإِذَا مَرِضَ فَعُدْهُ وَإِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ.

''ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں:

(۱) جب تمہاری اس سے ملاقات ہو تو اسے سلام کرو (۲) جب وہ تمھیں دعوت دے تو اس کی دعوت قبول کرو (۳) جب وہ تم سے مخلصانہ مشورہ مانگے تو تم بہتر سے بہتر مشورہ دو (۴) جب اس کو چھینک آئے اور وہ الحمدللہ کہے تو تم (یرحمک اللہ کے ساتھ) اس کا جواب دو (۵) جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرو (۶) جب وہ وفات پا جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔''

ترمذی کی ایک روایت ہے جس میں ایک اور حق بیان ہوا ہے:

''وَيُحِبَّ لَهُ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ''

''اس کے لیے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہو۔''

ان حقوق کے علاوہ اور بھی بہت سے حقوق ہیں جو جا بجا کتاب وسنت میں مذکور ہیں۔ غرض یہ کہ عوام کی خیر خواہی اور بھلائی کے لیے وہ تمام ذرائع اختیار کیے جائیں جو جائز حدود کے اندر ہوں۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ الدین النصیحة کے تمام پہلوؤں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

●●●

◆ مسلمان جس کا نام ہے، وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان واعتقاد میں راہِ راست ہے۔

◆ جو قوم عقل وفکر سے کام لیتی ہے اور تحقیق وانکشاف کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے اس کو ذہنی ترقی کے ساتھ مادی ترقی بھی نصیب ہوتی ہے۔

◆ خوشامد نہ صرف اخلاقی حیثیت سے ذلیل ہے بلکہ اس مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہوتی جس کے لیے انسان اپنے آپ کو اس پست منزل تک گراتا ہے۔

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

حق و باطل کی کشمکش کا ادراک

اسامہ عظیم فلاحی

انسان ہمیشہ دو قوتوں کی کشمکش کا حصہ رہا ہے۔ان دو قوتوں کو حق و باطل کی ناموں سے جانا جاتا ہے۔عملی کشمکش کی تاریخ دونوں کی یکساں طویل ہے۔آدم کی پیدائش حق کا استعارہ ہے تو اس کا حریف شیطان باطل کا سب سے بڑا علمبردار۔ دونوں کی زندگی کا بنیادی اور واحد مقصد اپنے مقابل کو شکست دے کر کامیابی کا حصول ہے۔آدم اور اس کی ذریت اس جنگ اور کشمکش میں کامیابی حاصل کر کے اپنے خالق کی رضا اور جنت حاصل کرنا چاہتی ہے جبکہ شیطان اور اس کے حواری انسان کو اپنے خالق کی رضا کی حصول سے دور کر کے اپنے ساتھ جہنم میں لے جانا چاہتے ہیں۔

باطل کا علمبردار شیطان چونکہ ابتدا ہی میں خدا سے بغاوت کر کے اپنے آپ کو اپنے رب کی رحمت سے دور کر چکا ہے اس لیے اب اس کے پاس اپنے رب کی رحمت کو متوجہ کرنے کے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں جس کے بعد اب اس کشمکش میں انسان کی پوزیشن سب سے زیادہ نازک بن جاتی ہے۔اسے فیصلہ کرنا ہے کہ اس کشمکش میں وہ خدا کا بندہ بن کر رہتا ہے یا شیطان کی صف میں کھڑا ہوتا ہے۔

یہاں سے انسان دو خانوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔انسانوں کا وہ گروہ جو مختلف مذاہب اور شیطانی افکار و خیالات کے حامل ہوتے ہیں وہ ایک طرف اور خالص الٰہی ہدایت کے پیروکار دوسری طرف ہوتے ہیں۔ انسانوں کے درمیان یہ دو گروہ حضرت آدم کی اولاد سے ہی وجود میں آگئے تھے اور یہ دونوں گروہ نہ صرف اپنے وجود کو برقرار رکھنے بلکہ غالب رہنے کے لئے ہمیشہ حالت کشمکش میں رہے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے کبھی غافل نہیں رہے کیونکہ دونوں کو معلوم تھا کہ کشمکش میں ہی ان کی بقا ہے۔ اس کشمکش میں الٰہی ہدایت کے پیروکاروں کی پشت پر خالق کائنات کی ذات ہمیشہ موجود رہی جس کی مدد اور نصرت کے بغیر وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے دوسری طرف خدا کے نافرمانوں کی پشت پناہی شیطان کرتا رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فریق کو عین حالتِ جنگ میں ہمیشہ دھوکہ بھی دیتا رہا جب کہ خدا ہمیشہ اپنے نیک بندوں کا سہارا بنا رہا۔

حق و باطل کی اس کشمکش میں حق کی ایک ہی صورت اور شکل رہی۔حق کے علمبرداروں کی پوری تاریخ یک رنگی نظر آئے گی، ہر قسم کی گندگی سے محفوظ ہوگی، صاف دل رکھنے والے شخص کے لیے وہ اجنبی نہیں ہوگی۔ دوسری طرف باطل کی دو چار دس نہیں ہزاروں شکلیں اور صورتیں ملیں گی، باطل تاریخ کے کسی حصہ میں مصنوعی بت پرستی کی شکل میں نظر آئے گا تو کبھی گئوسالہ پرستی کی چادر اوڑھ کر انسانوں کو دھوکہ دے رہا ہوگا۔کبھی قبائلی سرداروں کی پارلیمنٹ خدا کی شکل میں موجود ہوگی تو کبھی ذات برادری کے خانوں میں تقسیم کر کے انسانوں کی تذلیل کی گئی اور اس کو فلسفہ زندگی اور سنسکرتی کی بنیاد پر جبر کا نظام قائم کر کے کیا گیا۔تاریخ کے کسی حصہ میں باطل کو محسوس ہوا کہ انسان اس کے جال سے نکلنا چاہتے ہیں تو شکل وصورت بدل کر سابقہ نعروں کی جگہ کچھ نئے پُرفریب نعرے تخلیق کرتا ہے اور نعروں کی پشت پر اپنے پیدا کردہ علمیت کا پہاڑ کھڑا کر دیتا ہے۔ یہ نعرے کبھی قومیت کی شکل میں انسانوں کو ذلیل کرتے ہیں تو کبھی کمیونزم اور سیکولرازم کے

نام پر، کبھی الحاد کے نام پر تو کبھی وحدت ادیان اور ہیومنزم کے نام پر، غرض یہ کہ خواہشات کے مطابق ہر فرد کے لیے علیحدہ فلسفہ موجود ہے۔ باطل کی ہزاروں شکل و صورت سے حق کے علمبردار ہمیشہ واقف رہے ہیں، کیونکہ اللہ نے ان کی بنیادوں کو اپنے کلام کے ذریعے پہلے ہی واضح کر دیا تاکہ وہ اس کشمکش میں دھوکہ نہ کھائیں۔ باطل کو ہمیشہ باطل سمجھیں، اسے کبھی بھی حق کا خیر خواہ سمجھنے کی غلطی نہ کریں۔ کیونکہ ایسی غلطی کے نتیجے میں وہ سب سے پہلے اپنے رب کے مضبوط سہارے سے محروم ہو جائیں گے اور حق گڈمڈ ہو جائے گا اور تلاش حق کے متلاشی شکوک وشبہات کا شکار ہو جائیں گے۔

حق کے پیروکاروں کے لئے سب سے برا دور وہ ہوتا ہے جب باطل کے علمبردار قوت کے مراکز پر قابض ہوں اور طاقت کے زعم میں دندناتے پھر رہے ہوں اور اس کے بالمقابل حق کے دعوے دار خود حق کے تئیں جانثاری اور پامردی دکھانے میں نہ صرف ناکام ثابت ہو رہے ہوں بلکہ اپنے قول وعمل سے باطل کے بیانیہ کو مضبوطی فراہم کرنے کا سبب بن رہے ہوں۔

بھارت میں فکری انتشار گذشتہ صدی کا ایک بہت بڑا المیہ رہا ہے جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ انگریز صرف ایک قابض قوت کا ہی نام نہیں تھا بلکہ اس کی پشت پر مغربی تہذیب بھی موجود تھی جو یہاں کے باشندوں کو جسمانی غلامی کے ساتھ ساتھ مغرب کی فکری غلامی میں بھی جکڑنا چاہتی تھی۔ ابتداء میں انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے اور نظام اسلامی کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے علماء نے جہاد کا علم بلند کیا جس کی بڑی شکل تحریک شہیدین تھی۔ آزادی کی جدوجہد میں وہ وقت بڑا خطرناک تھا جب خالص اسلامی تحریکوں میں کلیدی حیثیت مشرک لیڈروں کو حاصل ہوگئی اور مشرکین کی پارٹیوں اور کمیٹیوں میں علماء و خواص نے اپنی خدمات پیش کرنا شروع کر دیا۔

تقسیم ہند کے بعد مسلم سربراہ آوردہ حضرات کی ایک بہت بڑی تعداد اس خام خیالی میں مبتلا ہوئی کہ یہاں کا نظام سیکولر بنیادوں پر کھڑا کر دیا گیا ہے جس میں نہ صرف اپنے مذہب پر عمل کی ضمانت دی گئی ہے بلکہ اس کی تبلیغ کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ بھارتی دستور میں دی گئی اس اجازت سے یہ سمجھ لیا گیا کہ ریاست اور سیاسی پارٹیاں اب مسلمانوں کی حریف بن کر ان سے برتاؤ نہیں کریں گی۔ یہ تصور سراسر فریب پر مبنی تھا۔ تقسیم ہند کے بعد ابتدائی سالوں میں ہی حکومت کے رویوں نے مستقبل کی طرف اشارہ کر دیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس وقت سے اب تک ہم اس صورت حال کو حق و باطل کی کشمکش کے عینک سے دیکھنے اور مقابلہ کرنے کے بجائے اس کی مختلف تاویلات کر کے شتر مرغ کی طرح طوفان سے بچنے کے لئے ریت میں سر چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد دستور میں صدارتی آرڈیننس کے ذریعے یہ بات شامل کی جاتی ہے کہ کوئی پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والا شخص مسلمان ہوتا ہے تو اس کو ریزرویشن سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس قانون کی اگر کوئی تاویل کر بھی لی جائے تو اس عمل کی کیا تاویل کی جائے گی جب سرکاری خزانے سے سومناتھ مندر کی تعمیر ہوتی ہے۔ یکساں سول کوڈ کا راستہ شروع میں کھول دیا جاتا ہے، مسلم پرسنل لاء میں مداخلت اور مسلمانوں کی قائم کردہ یونیورسٹیوں کے اقلیتی کردار کو چھیننے کے عمل کو کیا نام دیا جائے گا؟ بابری مسجد کا قضیہ تو دن کے سورج کی طرح روشن ہے کہ باطل نے اس کو نظریہ کی بنیاد پر لڑا جس میں ایڈمنسٹریشن، حکومت، عدلیہ سب اس کی پشت پر تھے اور ہم انہیں پر بھروسہ کیے رہے کہ یہ ہمیں انصاف دلائیں گے۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کا عالمی ڈرامہ رچا گیا۔ اس ڈرامے کے پس پردہ مقاصد بالکل واضح تھے اور یہ اسلام کے خلاف کھلی جنگ کا اعلان تھا۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کے بعد سب سے زیادہ نشانے پر وہ لوگ تھے جو دین کو نافذ اور قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے بعض لوگوں کی طرف سے یہ کہا گیا کہ بھارت میں رہتے ہوئے اسلامی نظام کے قیام کی بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کو جب دعوت دین کی آزادی ملی ہوئی ہے تو لوگوں تک دعوت پہنچائیں اور یہاں کی آبادی کو اسلام کی طرف لے آئیں۔ جس دن ہماری اکثریت ہو جائے گی اسلامی نظام خود بخود قائم ہو جائے گا لیکن ملت کے اکابرین کی یہ خوش فہمی بھی زیادہ دن نہیں رہی۔ ملک میں متعدد حضرات نے دعوت دین اور تبلیغ دین کا راستہ اپنایا۔ ان کی یہ دعوت برائے دعوت تھی، دعوت برائے اقامت دین اور غلبہ دین نہیں تھی۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک اس کا سب سے بڑا چہرہ تھے۔ ان کی دعوت ڈھکی چھپی بھی نہیں تھی، دعوتی مناظروں میں انہوں

نے دشمنان اسلام کو شکست سے دو چار کیا۔ ان کے اعتراضات کے مسکت اور دندان شکن جوابات دیے۔ ان کی یہ ساری سرگرمیاں بھارتی دستور کے دائرے میں چل رہی تھیں لیکن باطل کو کب گوارا تھا کہ انہیں برداشت کرے۔ بالآخر انتہائی سطحی اور بودے الزامات لگا کر ان کے اداروں کو بند کر دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ملک چھوڑ کر دوسرے ممالک کی شہریت اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی کیونکہ بھارتی حکومت ان کی حوالگی پر پورا زور لگائے ہوئے تھی اور فکری میدان میں اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتی تھی لیکن اللہ نے ڈاکٹر صاحب کی حفاظت فرمائی اور باطل کو رسوا ہونا پڑا۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کے بعد ملکی سطح کے داعیان اسلام پر باطل نے شکنجہ کسا۔ پہلے ڈاکٹر عمر گوتم صاحب کی گرفتاری عمل میں آئی اور پھر اس کا شکار مولانا کلیم صدیقی صاحب ہوئے۔ بھارت کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش میں قانون سازی کر کے دعوت دین پر تقریباً پابندی عائد کی جا چکی ہے۔ اب اس میدان میں قدم رکھنے کا مطلب جیل جانے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ ان تمام گرفتاریوں کے سلسلے میں سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ابھی بھی اس کو حق و باطل کی کشمکش کہنے اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ سیاسی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ سب کیا جا رہا ہے تو کوئی اسے الیکشن میں فائدہ اٹھانے کے لئے وجہ قرار دے رہا ہے۔ یہ حضرات صرف تبدیلی مذہب مخالف قانون کی شقوں کا مطالعہ کر لیتے تو آنکھیں کھل جاتیں کی باطل اس لڑائی کو نظریاتی بنیادوں پر لڑ رہا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم کو جنت کا شوق اور آخرت کا خوف دلاتا ہے تو وہ مجرم مانا جائے گا۔ ملّی تنظیموں کے قائدین کے مبہم بیانیہ کی دو ہی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ یا تو حد درجہ خوف میں مبتلا ہیں یا پھر نام نہاد سیکولر دستور اور پارٹیوں سے ابھی بھی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔

اس پورے منظر نامے میں تحریکات اسلامی کا بیانیہ بھی بہت واضح نہیں رہا ہے۔ ایک وقت تھا جب نظریاتی پس منظر رکھنے کی وجہ سے تحریک اسلامی کا ایک مضبوط بیانیہ ہوتا تھا اور حکومتیں اس بیانیہ پر توجہ دیتی تھیں لیکن شاید حالات کے جبر نے ان سے مضبوط بیانیہ کو چھین لیا ہے اور وہ اس کشمکش کو حق و باطل کی کشمکش کے نظریہ سے دیکھنے میں کوتاہ ثابت ہو رہی ہیں، جب کہ انہیں باطل کا براہ راست حریف ہونا چاہیے تھا۔

ہم نے ماضی قریب میں کسی قسم کی جدوجہد کی بھی ہے تو وہ حق و باطل کے نظریہ سے نہیں کی ہے۔ ہماری جدوجہد قومی یکجہتی، دستور کا تحفظ، جمہوریت کا تحفظ، بین المذاہب رواداری جیسے باطل نعروں کے ذریعے ہوئی۔ ظاہری بات ہے ان نعروں سے کچھ نام نہاد سیکولر حضرات کو اپنا قد بلند کرنے میں مدد ضرور ملی ہوگی لیکن ہمیں ملی سطح پر کامیابی کہیں نہیں ملی کیونکہ کامیابی اللہ کی نصرت کے بغیر ممکن نہیں اور یہ نصرت اسی وقت ملتی ہے جب ہمارے نعرے اور جدوجہد باطل افکار و نظریات اور ان کے افراد سے پاک ہوں۔ بار بار کے تلخ تجربات کے باوجود ہم وہی غلطیاں دوہراتے رہتے ہیں جو ماضی میں ہم کر چکے ہیں۔

ہماری کیفیت اس وقت کچھ اسی طرح کی ہے جیسا کہ سید قطب نے 60 سال قبل کہا تھا۔

”تلخ تجربات بار بار ہمیں تھپڑ مار مار کر جگاتے ہیں، مگر ہم ہوش میں نہیں آتے۔ ہم ان کے کید و مکر اور سازشوں سے، جو مختلف بھیس اختیار کرتی ہیں، بار بار آگاہ ہوتے ہیں، مگر عبرت حاصل نہیں کرتے۔ بار بار ان کی زبانوں سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو ان کے ان کینوں کی چغلی کھاتی ہیں مگر ہم متنبہ ہونے کے بجائے بار بار ان کے لئے اپنے دلوں کے دروازے کھولتے اور زندگی اور راہ عمل کے سلسلے میں انہیں اپنا رفیق بناتے ہیں۔ ہم ان سے خوشامد یا ان کے سلسلے میں ذہنی و روحانی شکست خوردگی میں اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ ہم اپنے عقیدے کے سلسلے میں بھی خوشامدانہ روش اختیار کرتے ہیں اور اس کے ذکر سے پرہیز کرنے لگتے ہیں، ہم اپنے طریق زندگی کے بارے میں بھی خوشامدانہ رویہ اپناتے ہیں، چنانچہ ہم اسے اسلام کی بنیاد پر قائم نہیں کرتے۔ ہم اپنی تاریخ کو مسخ کرنے اور اس کے نقوش راہ مٹانے کے سلسلے میں بھی یہی روش اختیار کرتے ہیں اور ہم کسی ایسی کشمکش کے ذکر سے، جو ہمارے اسلاف اور ہمارے ان جانی دشمنوں کے مابین ہوئی ہو، پرہیز کرتے ہیں! اور ان سب حرکات کے نتیجے میں ہم پر وہ عذاب نازل ہوتا ہے جو احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے ہے۔ ہم ذلت و خواری، ضعف اور غلامی سے دو چار ہوتے ہیں، ہم ان مصائب و آلام میں مبتلا ہوتے ہیں جن میں ہمارے دشمن ہمیں مبتلا دیکھنا چاہتے ہیں اور ہماری صفوں میں وہ ابتری اور کمزوری

رونما ہوتی ہے، جسے وہ پیدا کرنا چاہتے ہیں!''
(فی ظلال القرآن، ترجمہ سید حامد علی، ج ۲ ص ۲۷۰)

بھارت میں اسلام دشمن طاقتیں اس کشمکش میں کس قدر باریکی سے نگاہ رکھے ہوئے ہیں اس کا اندازہ وقتاً فوقتاً ان کے بیانات سے لگایا جاسکتا ہے۔ غزوۂ ہند کی بحث ہمارے درمیان بھلے ہی نہ ہوتی ہو لیکن سنگھ اس پر سنجیدگی سے مطالعہ کرتا ہے۔ خطہ میں بدلتے حالات پر اپنا واضح بیانیہ رکھتا ہے۔ حال ہی میں موہن بھاگوت نے وجے دشمی کے موقع پر ناگ پور میں ایک پروگرام میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مذہب کی بنیاد پر آبادی کے سلسلے میں اگلے پچاس سال کے لیے پالیسی بنانی ہوگی، ہندوؤں کی تعداد کم ہو رہی اور مسلمانوں کی بڑھ رہی ہے، مسلمان حملہ کرتے ہوئے آئے، طالبان سے الرٹ رہنے کی ضرورت ہے۔ ان کے تیور بتا رہے ہیں کہ مستقبل قریب میں ہماری ظاہری شناخت کو بھی یہ برداشت کرنے والے نہیں ہیں کورونا کی آڑ میں تبلیغی جماعت پر حملہ اس کی بہت بڑی مثال ہے۔ دشمن ہماری داڑھی ٹوپی اور نماز روزے کو بھی برداشت کرنے والا نہیں ہے، اور اسے کرنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسے معلوم ہے کہ حق کی ہلکی سی چنگاری بھی اس کے نشیمن کو خاکستر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اگر ہم نے جلد از جلد اس کشمکش میں اپنے رخ کو واضح نہیں کیا تو خطرہ اس بات کا ہے کہ کہیں ہم اللہ کی سنت استبدال (Replacement) کا شکار نہ ہو جائیں اور یہ عذاب ہوگا جو اللہ اپنے بدترین بندوں کو ہم پر مسلط کر کے نازل کرے گا۔

بھارت کے موجودہ سنگین حالات میں کچھ صاف صاف باتیں ہمیں کرنی پڑیں گی۔ ذیل میں کچھ باتیں درد دل کے واسطے پیش کی جارہی ہیں۔

(۱) منافقانہ رویہ سے اجتناب

اسلام کو خانوں میں تقسیم کر کے کچھ لے لینا اور کچھ چھوڑ دینا، اجتماعی زندگی میں کسی اور نظام کی پابندی پر مطمئن رہنا اور دین کو انفرادی زندگی تک محدود کر دینا، کھلے دشمنوں سے دوستی کی پینگیں بڑھانا اور اپنوں سے مسلک اور جماعت کی بنیاد پر دوری بنائے رکھنے جیسے رویوں سے گریز کرتے ہوئے اسلام کو کامل نظام حیات تسلیم کرتے ہوئے اس کے قیام کی جدوجہد پر سنجیدگی سے تیار ہونے کی شدید ضرورت ہے۔

(۲) سربراہ آوردہ طبقے کی سنجیدگی

ملت کے سربراہ آوردہ طبقے کو اپنے رویہ پر غور کرنا ہوگا۔ ان کے بیانات اور گفتگوؤں سے ملت کی نفسیات پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ملی اداروں میں عہدے کی لڑائی جب عوام میں بحث کا موضوع بن جائے تو یہ بہت خطرناک صورت حال ہوتی ہے۔ دوسری طرف جب یہ حضرات اپنے قول و عمل سے دشمنوں کے بیانیہ کو تقویت دینے لگتے ہیں تو ملت شدید اضطراب میں مبتلا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملت کا سربراہ آوردہ طبقہ وژن سے خالی اور مستقبل کے چیلنجز کے ادراک سے محروم ہے۔ ان کی اس کیفیت نے اتنی بڑی ملت کو بے سمت بنا دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ طبقہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے اور حالات کی نزاکت کو سمجھے۔ اپنے رویہ سے انتشار میں اضافہ کا سبب نہ بنے۔

(۳) دشمنان اسلام کے اقدامات کا بروقت جواب دینا

دشمنان اسلام کے فکری اور جسمانی حملوں کا جواب بعض دفعہ خاموشی سے دینا حکمت عملی کا حصہ ہوسکتا ہے لیکن کوئی بھی جواب نہ دینا یا بالکل خاموشی اختیار کرتے ہوئے عملی اقدام سے دور رہنا ملت کے مجموعی مفاد کے حق میں نہیں ہوسکتا۔ ہجومی تشدد کا شکار اب تک سینکڑوں مسلمان ہو چکے ہیں جس کے سلسلے میں بیانات سے آگے ہم کچھ نہیں سوچ پا رہے ہیں۔ بہت سوچا تو قانونی پیروی کی بات کر لی جاتی ہے جس کا کوئی نتیجہ آخر میں نہیں نکلتا۔ شہریت ترمیمی قانون پر ملی تنظیموں کے قائدین کا سکوت دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نوجوانوں کے محاذ سنبھالنے کے بعد رسماً انہوں نے کچھ بیانات دے کر خانہ پری کر لی۔ ضرورت ٹھوس اقدامات کی ہے۔ ہجومی تشدد، سنگھی حضرات کے تکلیف دہ بیانات، میڈیا ٹرائل، داعیان دین کی حفاظت، مسلم بچیوں کے تحفظ وغیرہ کے سلسلے میں ٹھوس اقدام وقت کی شدید ضرورت ہے۔

(۴) حق و باطل کی پہچان

ہمیں اول و آخر یہ سمجھنا ہوگا کہ ہم حق و باطل کی شدید کشمکش کے دور میں جی رہے ہیں۔ اس دور میں حق کے انکار سے زیادہ حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کر کے پیش کرنے کی زیادہ کوشش ہوتی ہے۔ براہ راست حق کا انکار ایک مشکل اور نتائج کے اعتبار سے مفید نہیں ہوتا۔ اس لیے باطل نہایت ہوشیاری سے حق کے علمبرداروں

میں اپنے ایجنٹ تلاش کرتا ہے اور اس کے ذریعے صحیح فکر کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم باطل کی طرف سے نت نئے انداز میں فکری یلغار کو سمجھنے کی کوشش کریں۔حق و باطل کی پہچان کیے بغیر اس کشمکش میں کامیابی ممکن نہیں۔

(۵) حب الدنیا و کراہیۃ الموت کی بیماری سے پرہیز

کسی بھی کامیاب انقلاب کی بنیاد میں دنیا سے بے رغبتی اور موت سے محبت بنیاد کے درجہ میں ہوتی ہے، بھلے ہی اس کے پیچھے نیت کچھ بھی ہو۔غلبہ دین کی جدوجہد فرائض میں سے ہے۔یہ فریضہ جان و مال کی قربانی مانگتا ہے۔اس کی ادائیگی اسی وقت ممکن ہے جب دل دنیا کی محبت سے خالی ہوں اور موت ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے۔دنیا کے مادی مفادات ایک مجاہد کے پاؤں کی بیڑی نہیں بن سکتے،دوسری طرف اس کی جان سے قیمتی اس کا نظریہ اور ایمان ہے جس کی خاطر موت کو گلے لگانا سعادت کا بلند ترین مقام ہوتا ہے۔یہ کیفیت جب کسی فرد کی ہوتی ہے تو اللہ اس کے نام کا چرچا ہر طرف بکھیر دیتا ہے اور یہ کیفیت جب اقوام و ملل میں پیدا ہوجاتی ہے تو دنیا کی امامت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اور جب کوئی فرد یا قوم دنیا کی محبت اور موت سے نفرت کی بیماری میں مبتلا ہوتی ہے تو ساری دنیا مل کر اسے عزت دینے کی کوشش کرے تو بھی یہ ممکن نہیں۔آج ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حکومت میں موجود قوتیں اپنے مخالفین پر ای ڈی کے ذریعے کس طرح گھیرنے کی کوشش کرتی ہیں، مخالفین کے گھروں پر بلڈوزر چلا دیے جاتے ہیں اور ہر ممکنہ نقصان کے ذریعے انہیں دبانے کی کوشش ہوتی ہے۔حق و باطل کی کشمکش میں اہل ایمان بھی اس مرحلے سے گذریں گے جس کے مقابلے کے لیے انہیں سب سے پہلے اس بیماری سے نجات حاصل کرنا ہوگا ورنہ دشمنوں کے لیے تر نوالہ بنیں گے۔

(۶) ہمارا خیمہ باطل کے افراد سے پاک ہو

پچھلی ایک صدی کا المیہ رہا ہے کہ ہم نے اپنے خالص اسلامی مفادات کے حصول کے لیے باطل کے سرغنوں تک سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی،ان کی بول چال اختیار کی،اپنے اصولوں اور شعائر سے مداہنت کی لیکن آخر میں ہمیشہ دھوکہ کھایا اور ناکام ہوئے کیوں کہ کفار آپ کے کبھی بھی ہمدرد اور دوست ہو ہی نہیں ہوسکتے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی قبر کو اللہ نور سے بھر دے، آپ نے بہت پہلے اس مرض کی طرف واضح اشارہ کر دیا تھا۔تحریک خلافت کے دوران ہندو مسلم اتحاد کے عارضی مظاہر دیکھنے میں آئے تھے لیکن مولانا تھانوی کی ہندوؤں اور گاندھی سے متعلق آخری رائے یہ تھی کہ وہ مسلمان قوم کے دوست و ہمدرد نہیں ہوسکتے۔مولانا کی رائے میں اگر مسلمان خود اپنی اصلاح کرلیں،مذہب کا دامن مضبوطی سے تھام لیں تو پھر ان کو کسی سے امداد یا اتحاد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ایک دوسری مجلس میں فرمایا۔ کوئی انگریزوں میں گھستا ہے کہ ان کے پاس ہماری فلاح و بہبود کے اسباب ہیں،ان کا لباس، ان کی سی بول چال،انکی معاشرت اختیار کرلیتا ہے۔کوئی ہندو کے بغل میں جا گھستا ہے کہ ان کے ساتھ رہنے میں ہماری فلاح و بہبود ہے۔ان کے ساتھ رہ کر احکام اسلام تک کو پامال کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں،حتی کہ ایمان تک کو قربان کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔مگر رہے کورے کے کورے،نہ ہندوؤں نے کچھ دیا نہ انگریزوں نے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری جدوجہد بالکل خالص ہو۔اس میں کسی مشرک اور کافر سے چھوٹی موٹی کچھ خدمات تو لی جاسکتی ہیں لیکن انہیں کلیدی پوزیشن کسی حالت میں نہ دی جائے ورنہ خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑے گا کیونکہ وہ ہمارے معتمد کبھی بھی نہیں ہوسکتے۔جو اپنے خالق و مالک اور اس کے دین کو نہ قبول کرے وہ اس کی امت کا خیر خواہ کیسے ہوسکتا ہے!!

●●●

*

اگر خیر کے علمبردار بھی میدان میں موجود ہوں اور وہ اصلاح کی کوشش کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں تو عوام الناس پر علمبرداران شر کا اثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔کیونکہ ان دونوں کا مقابلہ آخر کار اخلاق کے میدان میں ہوگا اور اس میدان میں نیک انسانوں کو برے انسان کبھی شکست نہیں دے سکتے۔سچائی کے مقابلے میں جھوٹ،ایمانداری کے مقابلے میں بے ایمانی اور پاکبازی کے مقابلے میں بدکرداری خواہ کتنا ہی زور لگائے،آخری جیت بہرحال سچائی،پاکبازی اور ایمانداری ہی کی ہوگی۔ (بناؤ اور بگاڑ)

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

تجربات زندگی کا نچوڑ

عبدالماجد دریابادیؒ

کتاب، بلکہ کہنا چاہیے کہ کتاب زندگی کا مشکل ترین باب یہی ہے، ۷۵ سال کی زندگی کا خلاصہ تجربات میں کیا لکھا جائے اور کیا چھوڑا جائے؟ جی میں تو بے اختیار یہی آرہا ہے کہ داستان زندگی (آہ، کہ کتنی لذیذ، اور آہ کہ کتنی تلخ، دونوں ایک ہی وقت میں) کُل کی کُل بغیر ایک حرف چھوڑے دہرادی جائے۔ داستان زندگی کے دہرانے میں لگتا ایسا ہے کہ جیسے زندگی خود اپنے کو دہرا رہی ہے! سوچنے بیٹھئے تو اپنی زندگی قابل صد نفریں و مستحق ملامت، اور نہ سوچئے تو جان عزیز سے بڑھ کر عزیز، لذیذ کوئی شے ممکن نہیں!

سب سے پہلی بات تو یہ خیال رکھنے کی ہے کہ طبعی تقاضا وشوق اور چیز ہے اور ہوس اور چیز، بہ قول حضرت اکبر الہ آبادی:

کہنے کی ایک حد ہے بکنے کی حد نہیں

جو فرق کہنے اور بکنے میں ہے وہی طبعی تقاضے اور ہوس میں ہے ع

وہ راہبر کی ہدایت، یہ رہ گزر کا فریب

طبعی تقاضوں کی تکمیل کی جاسکتی ہے لیکن ہوس کی آگ بجھانے کے لیے کوئی حد ونہایت نہیں، ہوس رانی جتنی بھی کیجئے گا، طبیعت بجائے آسودہ ہوجانے کے حریص سے حریص تر ہوتی جائے گی، آگ بجھنے کے بجائے بھڑکتی ہی جائے گی، ضرروزیاں صریح واقع ہوتا جائے گا، لیکن طبیعت کو اس کا احساس ہی سرے سے جاتا رہے گا۔ نفس امارہ بڑا منطقی، بڑا فقیہ واقع ہوا ہے، ہر نفس پرستی، ہر ہوسناکی اور اس سے پیدا ہونے والے ہر ضرروزیاں کی کوئی نہ کوئی خوب صورت سی تاویل وتوجیہ ہر بار کرے گا اور ھل من مزید کے نعرے لگاتا ہوا آپ کو برابر مغالطہ میں مبتلا اور دھوکے میں الجھائے رہے گا! لازم ہے کہ ہر خواہش نفس پر حاکم طبیعت کو نہیں، عقل کو رکھیئے اور عقل کی حاکمیت کا نفاذ بڑی سختی سے کرتے رہیئے، ہیجان نفس کے وقت (عام اس سے کہ وہ ہیجان غصہ کا ہو، حب جاہ کا ہو، حرص مال کا ہو، شہوت جنسی کا ہو) عقل تک اندھی اور مغلوب ہوجاتی ہے! ایسے موقع پر دست گیری شریعت سے پائیے اور پناہ احکام خداوندی میں ڈھونڈھئے، نفس کو بے لگام کسی حال میں بھی نہ ہونے دیجئے، اس شورہ پشت گھوڑے سے آپ ذرا بھی غافل ہوئے اور اس نے آپ کو زمین پر دے پٹخا!۔ غصہ اور شہوانیت، یہ نفس کے دو بے پناہ حربے ہیں اور انسانیت کے دشمن قاتل! اگر ان پر نوعمری ہی میں قابو پالیا گیا، انھیں عقل اور اس سے بڑھ کر شریعت کے تحت میں لے آیا گیا، جب تو خیر ہے، ورنہ اگر یہ سنپولے بڑھ کر اژدہے ہوگئے تو کوئی صورت ان کے عذاب سے نجات پانے کی نہ رہے گی، سن کے ساتھ ساتھ ان کی گرفت بھی سخت سے سخت تر ہوتی جائے گی، انسان خمیازہ اٹھائے گا، پچھتائے گا، جھنجلائے گا، پھر بھی بس پھڑ پھڑا کر رہ جائے گا، ان کے پنجہ سے رہائی کی کوئی صورت آسان نہ ہوگی!

روپیہ کی محبت بھی بڑی بری بلا ہے، سن کے ساتھ ساتھ یہ گھٹتی نہیں، بلکہ حرص وہوس عموماً بڑھ ہی جاتی ہے اور وجہ جواز میں ذہن نئی نئی ضرورتیں گڑھنا شروع کردیتا ہے، ضرورت اس صورت حال پر شروع ہی سے قابو پالینے اور اپنے کو قناعت کا خوگر بنالینے کی ہے، یہ جس نے نہ کیا، اسے تلخیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں گی لیکن روپیہ کی محبت اور شے ہے اور اس کی قدر اور، روپیہ کی محبت تو

بے شک ہر گز نہ پیدا ہونے پائے،لیکن روپیہ کی قدر ضرور ہو، یہ نہ ہوا تو دوسرا مرض اسراف کا پیدا ہوکر رہے گا،بخل واسراف دونوں مرض ایک ہی درجہ کے ہیں اور دونوں بڑے سخت ۔ان کے حملے سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی واحد صورت یہ ہے کہ قلب کو ایک طرف حب مال سے خالی رکھا جائے اور دوسری طرف روپیہ کی ناقدری سے ۔

دل کو ریا و نمائش سے خالی اور اخلاص سے لبریز رکھنا بھی کوئی آسان و معمولی چیز نہیں، بڑی ریاضت اور بڑے مجاہدوں کے بعد ہی یہ دولت ہاتھ آسکتی ہے اور پھر بھی ہر وقت ڈگمگا جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے " وما یُلَقَّاهَا اِلاَّ ذُوْ حَظٍّ عَظِیْم "۔ایک بڑا دخل اس میں صدق دل سے دعا مانگنے کا ہے اور اسباب و ذرائع شہرت سے اپنے کو دور رکھنے کا ہے ۔نفس عاشق ہے جاہ کا اور انسان ایک حد تک خوشامد پسند طبعاً ہوتا ہے ، راہ اخلاص کا سب سے بڑا راہزن،مداحوں،معتقدوں، مریدوں کا گروہ ہوتا ہے، ہر وقت کی داد و تحسین رضا جوئی حق کا گلا گھونٹ دیتی ہے ۔تفسیر قرآن تک کے بہ ظاہر سو فی صد خالص دینی کام کو جب سوچتا ہوں اور اپنے پر جرح کرتا ہوں کہ اگر داد و تحسین خلق ،مسرت نفس اور مالی منفعت وغیرہ سارے خارجی خیالات کو منتزع کرلیا جائے جب بھی یہی اہتمام وانہماک کام کے لیے باقی رہے گا؟ تو ضمیر کچھ کانپ سا اٹھتا ہے!

’علم‘ بہ معنی لکھائی پڑھائی ،کتابوں کی ورق گردانی کے شوق کا مرض بچپن سے رہا ہے ۔اب بھی طالب علم ہی ہوں، ہر وقت اپنے گرد ایک کتب خانہ چاہتا ہوں، بغیر کتابوں کے وقت کاٹنا دشوار ہو جاتا ہے ۔ بارہا شوق مطالعہ کے آگے دوسرے طبعی و جسمانی شوقوں کو مغلوب کر چکا ہوں، لیکن پھر بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس سے ہوتا کیا ہے اور اس سے حاصل کیا، جب تک یہ دُھن تمام تر رضائے حق کی خاطر نہ ہو ! دنیا میں بالفرض اردو کا نامی مصنف اور گرامی اہل قلم کہہ کر پکارا بھی گیا تو حشر میں یہ القاب کیا نفع پہنچائیں گے اور حیات ابدی کے حصول میں یہ کیا کام آئیں گے!

والدہ ماجدہ کی خدمت تو خیر تھوڑی بہت پھر کچھ بن پڑ گئی ،لیکن والد ماجد کی خدمت کی توفیق تو ذرا بھی نہ ہوئی بلکہ فساد عقائد و فساد عمل دونوں کے باعث ان کی اخیر عمر میں ان کے لیے سوہان روح ہی بنا رہا۔اور جب از سر نو مسلمان ہوا تو وہ مرحوم راہیٔ جنت ہو چکے تھے ۔ رہے دوسرے اعزہ و احباب اور سابقہ والے، تو کسی کے بھی حق ادا نہ کر سکا۔اور عبادت کا حال تو اور بھی ابتر، نمازوں میں بجز ٹکر لگانے کے اور کیا کیا، اور روزہ میں بجز بھوکا رہنے کے ،اور حج بھی الٹا سیدھا، خدا معلوم کس طرح کر کے بس ایک چھدّا سا اتار آیا،غرض نہ ادھر کا نہ ادھر کا سوچتا ہوں کہ اپنا حشر کیا ہونا ہے ۔ لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین سوائے اس کے کہ وہ ارحم الراحمین اپنے ارحم الراحمینی کا کرشمہ دکھادے ، یا اپنے رحمت عالم پیمبر اور دوسرے شافعین کو شفاعت کا اشارہ کر دے!شادی عمر کے ۲۴ ویں سال اپنی پسند و محبت پیدا ہو جانے کے بعد کی ، اور وہی عشق بہت سے اتار چڑھاؤ بڑے ہی پیچ و خم کے بعد آج تک قائم ہے ۔عشق کا لفظ غلط استعمال ہوا ’’فریب آب و گل‘‘ کا نام عشق رکھنا ،حقیقت اور لغت دونوں پر ظلم کرنا ہے، اور اسی کھوکھلے عشق کا حاصل حصول بقول اکبر ؎

کار جہاں کو دیکھ لیا میں نے غور سے
اک دل لگی ہے سعی میں حاصل میں کچھ نہیں!

دل لذت اٹھانے پاتا بھی نہیں کہ خود لذت چھلاوہ بن کر نظر سے غائب ہو جاتی ہے !بڑے ہی تلخ تجربوں اور خوب ہی ٹھوکریں کھانے کے بعد یہ پُر زور وصیت سارے ناظرین سے ہے کہ دنیا سے دل ہر گز نہ لگائیں اور اس کے مکر و فریب میں نہ آئیں جس کے صد ہا چہرے اور بے شمار نقابیں سہی لیکن انسان بہر حال جسم و جسد کے ساتھ ہی اس خاکدان میں بھیجا گیا ہے،اس حکمت کی بھی رعایت رکھنا لازمی ہے، دنیا برتئے مگر دل نہ لگائیے،دل تو آخرت ہی سے لگائے رہئے،اکبر ہی کی لفظوں میں ؎

غافل نے اِدھر دیکھا،عاقل نے اُدھر دیکھا

دیکھئے،ابھی کتنی اور میعاد کاٹنا ہے،دل تو اُسی مژدہ جاں بخش کے سننے کو تڑپ رہا ہے کہ:

"اِرْجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرۡضِیَّةً
فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ وَ ادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ"

اپنے حق میں تو بس ایک ہی اور آخری دعا یہ ہے کہ بُلاوا اس وقت آئے جب یہ ناکارہ اور آوارہ قلم، دین کی خدمت میں مشغول ہو،اور کسی عدو اللہ کے ہفوات کا جواب دے رہا ہو، یا اپنے محبوب کی کسی ادا کی معرفت کی دعوت دے رہا ہو!

پڑھنے والے، رخصت! اس عالم ناسوت میں آخری سلام،ملاقات بفراغت و اطمینان انشاء اللہ بس اب جنت ہی میں ہوگی!

●●●

مسلم معاشرے میں کفالت کا ناپید ہوتا تصور

پرویز نادر

دین اسلام، مسلم معاشرے کی جن بنیادوں پر اصلاح وتعمیر کرتا ہے وہ مغرب کے حصول دولت کے تصورِ جدید (جس میں مفاد پرستی اور خودغرضی شامل ہے) اور دولت کی مساویانہ تقسیم (اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کی عطا کردہ) پر نہیں کرتا بلکہ وہ تحفظِ حقوق اور دولت کی عادلانہ تقسیم پر کرتا ہے اور ساتھ ہی محنت کش طبقہ یا جو افراد غربت کا شکار ہیں اسلام ان کی عزت نفس کو چوٹ بھی نہیں لگنے دیتا رذیل واعلیٰ اور اشرف وکمتر کا فیصلہ افراد کی دولت پر نہیں بلکہ تقویٰ کی بنیاد پر قرار دیتا ہے۔ وہ افراد کی دولت کو انہیں کے پاس جمع بھی نہیں رہنے دیتا بلکہ زکوٰۃ اور صدقات کے ذریعے معاشرے کے حاجت مندوں کی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور اس کے لیے قانونی گرفت سے زیادہ وہ روحانی اور اخلاقی طور پر لوگوں کو تیار کرتا ہے، ویسے تو معاشرے کے ضرورت مند، اور امداد کے مستحق افراد کی حاجت روائی وضروریات کی تکمیل خلافت کے ادارے کے ذمہ ہے ساتھ ہی معاشرے کے امراء وفارغ البال لوگ اس فریضے سے بری نہیں ہو سکتے۔ انھیں اطراف میں بسنے والے پریشان حال لوگوں کا خیال رکھنا بہرحال ضروری ہے لیکن جب سے خلافت کا ادارہ منتشر ہوا ہے اجتماعی سطح پر اس پہلو سے زوال آگیا۔

ضرورت مند لوگوں کی ضروریات کا خیال مسلم سلاطین نے بھی باضابطہ رکھا ہے اور بادشاہت کے دور کے خاتمے کے بعد اب یہ ذمہ داری مسلم معاشرے پر مجموعی طور پر عائد ہوتی ہے کہ وہ جس ملک اور معاشرے میں بھی رہتا ہو یہ ذمہ داری ساقط نہیں ہوتی۔ جس طرح نماز، روزہ، اور حسب استطاعت حج ہر حالت میں فرض ہے اسی طرح غرباء ویتامی کی دست گیری اور ان کی ضروریات کا خیال بھی اخلاقی فرض ہے اور کسی بھی معاشرے میں ایک دوسرے کا احترام اور عزت وحقوق کا تحفظ اور امن وامان وخوشحالی اسی وقت تک ممکن ہے جب تک اس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں اور غرباء ویتامی کے ساتھ ناروا اور امتیازی سلوک نہ کیا جاتا ہو اور ان کی کفالت یا کم ازکم ان کی ضروریات کا انتظام کیا جاتا ہو، بصورت دیگر اس معاشرے یا سوسائٹی میں جہاں غرباء اور یتامیٰ کے ساتھ امتیازی وناروا سلوک کیا جاتا ہو وہاں ایک دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور نفرت وجرائم کی فضا تیار ہوتی ہے جو امن و امان خراب کرکے رکھ دیتے ہیں، چوری ڈکیتی کے واقعات میں اضافہ ہوجاتا ہے اور قتل و غارت گیری کا ماحول پنپنے لگتا ہے، یہ باتیں ایک غیر مسلم سماج ومعاشرے کی سمجھ سے بالاتر تو ہو سکتی ہیں کیونکہ وہاں دنیاوی کامیابی، معیار اور دولت و پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ جس سوسائٹی میں رزق کی تنگی کے اندیشوں اور خوف کی وجہ سے فیملی پلاننگ کے نام پر اپنی ہی اولاد کو دنیا میں آنے سے روک دیا جاتا ہو اور جس اولاد کو پرورش کرکے بڑا کیا جاتا ہے وہی اولاد جس کی خاطر اس کے ماں باپ نے اس کی جائداد میں دوسرے شریک کار کو دنیا میں آنے نہ دیا، ایک وقت کے بعد وہ انہیں کو اولڈ ایج ہوم

(old age home) چھوڑ آتے ہیں وہاں اپنے پڑوس اور معاشرے کے کمتر وغرباء کے لیے کوئی ہمدردی وغم گساری کا تصور کیسے پایا جائے گا، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ راہ چلتے معذور ومجبور نظر آنے والوں کو خیرات کے نام پر کچھ دے دیا جائے گا۔لیکن جس امت کو آسمانی کتاب،اور اللہ کے پیغمبر کے زبان وعمل سے نہ صرف وعظ ونصیحتیں اور تفہیم وتاکید کی گئی ہو بلکہ مواخات، ہمدردی وغم گساری کے قابل تقلید اور بے نظیر اصولوں کے ذریعے پورا ایک معاشرہ وجود میں لاکر اور ایسی جیتی جاگتی سوسائٹی رکھ دی گئی ہو جہاں غلاموں کو اٹھا کر اپنی کفالت میں لے کر تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کیا گیا کہ اگلے وقت میں وہ معلم اور سپہ سالار بن گئے اور امیر وفقیر کے امتیاز کو ایسا کچلا گیا کہ وہ مستقبل کے سردار بن گئے۔پڑوسیوں اور اپنے اقرباء کے حقوق کو اتنا اوپر اٹھایا گیا کہ جس وقت وہ عملی معاشرہ وجود میں آرہا تھا لوگ سمجھنے لگے تھے کہ شاید ہمارے اقرباء اور پڑوس کے امداد کے مستحق افراد ہماری املاک وجائداد میں شریک ہیں اور یہ بات ایسی نہیں تھی کہ لوگ یہ سوچ کر گھبرانے لگے، بلکہ اس شدید احساس نے کہ کہیں ان حقوق کی ادائیگی میں ہم سے کوتاہی ہوجائے تو آخرت میں پکڑے نہ جائیں اور سارے اعمال برباد نہ ہوجائیں۔ وہ بے چین ہوجاتے تھے جس کی منظر کشی اللہ تعالی نے قرآن مجید میں اس طرح کی ہے۔

''اور یہ لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ان کے حال کی اصلاح بہترین بات ہے اور اگر اُن سے مل جل کر (نان نفقہ و کاروبار وغیرہ میں) رہو تو یہ بھی تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ مصلح کون ہے اور مفسد کون ہے۔''(البقرۃ:۲۲۰)

ایسے سینکڑوں حقیقی واقعات سے تاریخ کے اوراق مزین ہیں جس کے اثرات نے بعد کی دنیا میں بھی بے مثال نقش چھوڑے جس کو شاعر مشرق علامہ اقبال نے کوزے میں سمندر سمیٹتے ہوئے کہا کہ:

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

لیکن اتنی درخشاں اور انسانیت کی اعلی قدروں کی تاریخ اپنے پاس رکھنے کے باوجود آج مسلم معاشرہ اور بطور خاص اپنے آپ کو مہذب و انتہائی تعلیم یافتہ سمجھنے والی، اپنی ترقیوں اور دریافیات پر پھولے نہیں سمانے والی جدید اقوام انسانیت نوازی کے ان اصولوں کی روح سے خالی ہیں، اگرچہ مسلم معاشرہ آج بھی زکوۃ (اپنی مخصوص فرضیت کے ساتھ) صدقات اور امداد میں دیگر مذاہب و اقوام سے کہیں زیادہ آگے ہے مگر اس کے پاس بھی غرباء ویتامیٰ اور حاجت مندوں کی امداد و کفالت کا مفہوم و ترجیحات بدل کر رہ گئی ہیں، بطور خاص کفالت کا نبوی تصور ناپید ہوگیا ہے۔قرون اولیٰ کی اسلامی تہذیب اور معاشرے کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس سوسائٹی میں مستقل کفالت کا تصور تھا جس میں یتامیٰ اور مساکین کی وقتی امداد سے بڑھ کر ان کی پرورش اور نان نفقے کا پورا انتظام اپنے ذمہ لینا تھا، اس معاشرے میں جب کوئی بچہ یتیم ہوتا تو کئی ہاتھ بلند ہوتے جو اسے تھامنے کی کوشش کرتے اور وہ فرد خوش نصیب سمجھا جاتا جس کے حصے میں کسی یتیم کی کفالت آتی، اسی معاشرے میں جہاں غلاموں کو جانور سے بدتر سمجھا جاتا تھا جب اسلام اس سوسائٹی میں سرایت کرگیا تو نہ صرف غلاموں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر آزاد کرایا گیا بلکہ اپنے پاس جو غلام تھے انہیں اپنے گھر کا معزز فرد سمجھ کر ان کے حقوق کا پورا خیال رکھا گیا اور انہیں وہی کچھ پہنایا، کھلایا اور پڑھایا گیا جو اپنے حقیقی اور نسبی بچوں کے ساتھ انسان کرتا ہے، زید بن حارثہؓ، حضرت بلالؓ، خباب بن ارت، سلمان فارسیؓ اور آل یاسرؓ یہ لوگ وہی تھے جنہیں معاشرے میں کوئی عزت کی زندگی میسر نہ تھی اور ان میں کچھ تو وہ تھے جنہیں کبھی اپنے آقا کے سامنے اس کی مرضی کے بغیر کوئی عمل تو درکنار حرکت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔لیکن اسلام کے آنے اور آپؐ کے ذریعے غلاموں کو آزاد کرانے اور ان کے ساتھ حسن سلوک اور کفالت کے باب میں قرآن اور حدیث میں اس قدر نصیحتیں، وعیدیں اور احکام وارد ہوئے کہ اس معاشرے کا کوئی فرد اپنے پڑوس کے حاجت مندوں کا جب تک جائزہ نہیں لے لیتا وہ رات کو سو نہیں سکتا تھا۔اسی باب میں رسول کریم ﷺ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

''مجھے جبرائیل علیہ السلام برابر پڑوس کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ خیال ہونے لگا کہ وہ پڑوسی کو وارث بنادیں گے۔''(ابن ماجہ 3673)

غور فرمائیے اس حدیث میں پڑوسی کی حیثیت

تو نہیں بتائی گئی لیکن اس کے حقوق جتنے شدت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اس سے ہمیں غرباء اور یتامی کے حقوق کا اندازہ لگالینا چاہیے، اس سے بڑی ہمدردی، انسانیت نوازی اور دوسروں کی کفالت کی مثال کیا ہوگی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کا مشغلہ ہی بن گیا تھا کہ وہ غلاموں کو سردارانِ قریش سے خرید کر آزاد کرادیتے تھے نیز حضرت ابوبکرؓ صدیق کا ایک ہی واقعہ کفالت کے پورے تصور کو واضح کردیتا ہے۔ حضرت مسطحؓ آپ کے قرابت دار تھے اور بڑے نادار و مفلس بھی جس کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کی کفالت کیا کرتے تھے۔ واقعہ افک میں جب منافقین نے حضرت عائشہؓ کی سیرت کو داغدار کرنے کی غرض سے تہمت لگائی اور خوب پروپیگنڈہ کیا تو حضرت مسطحؓ بن اثاثہ نادانستہ طور پر اس کا شکار ہوگئے۔ اس واقعے میں اماں عائشہ کی پاکبازی اللہ نے خود سورہ نور کی آیات ۱۱ تا ۲۰ میں بیان فرمائی جس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قسم کھائی کے وہ حضرت مسطحؓ کی کفالت بند کر دیں گے اور یہ عمل انسانی جذبات کی بنا پر دیکھا جائے تو غلط بھی نہیں تھا لیکن اللہ نے اس بات پر نکیر کرتے ہوئے فرمایا:

"اور تم میں سے جو لوگ اہل خیر ہیں اور مالی وسعت رکھتے ہیں، وہ ایسی قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں، مسکینوں اور اللہ کے راستے میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہیں دینگے اور انہیں چاہئے کہ معافی اور درگزر سے کام لیں۔ کیا تمہیں یہ پسند نہیں کی اللہ تمہاری خطائیں بخش دے؟ اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔" (سورۃ النور: ۲۲)

ان آیات کے نزول کے بعد آپؓ نے حضرت مسطحؓ کی امداد بدستور جاری رکھی، یتیموں کے حقوق کے تعلق سے اس معاشرے کے لوگ اتنے حساس تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سوالات لے کر آیا کرتے تھے جس کی منظر کشی قرآن میں اس طرح کی گئی:

"اور یہ آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ ان کی خیر خواہی کرنا بہتر ہے اور اگر تم ان کا مال اپنے مال میں بھی ملالو (بغرض نان نفقہ اور کاروبار) تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ بدنیت اور نیک نیت ہر ایک کو خوب جانتا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا، یقیناً اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔" (سورۃ البقرہ: ۲۲۰)

جن یتیموں کو وراثت میں مال ملا ہوا ہے اور وہ ابھی سن رشد کو نہیں پہنچے ہوتے تو صحابہ کرامؓ ڈرتے تھے کہ ان کے اموال میں سے خرچ کرنا کہیں گناہ تو نہیں کیوں کہ ایک یتیم چاہے وراثت میں کتنی بھی دولت پائے لیکن اپنی ضروریات اور تعلیم و تربیت وہ خود نہیں کرسکتا اسے بحر حال ایک کفیل کی ضرورت تو رہے گی۔ اسلام دراصل چاہتا یہی ہیکہ جب یتیم کے سر سے باپ کا دست شفقت اٹھ جائے تو اس کمی کو پورا کیا جائے اور باعزت طریقے سے اس کے سر پر دست شفقت پھیرنے والا اسے مل جائے جس کی ضرورت کا احساس کراتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور (یتیموں سے معاملہ کرنے والے) لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ اپنے پیچھے ناتواں بچے چھوڑ جاتے تو (مرتے وقت) ان بچوں کے حال پر (کتنے) خوف زدہ (اور فکرمند) ہوتے، سو انہیں (یتیموں کے بارے میں) اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے اور (ان سے) سیدھی بات کہنی چاہئے۔ بے شک جو لوگ یتیموں کے مال ناحق طریقے سے کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں نری آگ بھرتے ہیں، اور وہ جلد ہی دہکتی ہوئی آگ میں جا گریں گے۔" (سورۃ النساء: ۹۔۱۰)

اب ذرا ہم اپنے مسلم معاشرے کا جائزہ لیکر دیکھیں۔ درج بالا سطور میں جس معاشرے کی تصویر پیش کی گئی ہے کیا ہمارے پاس کفالت کا ویسا ہی تصور ہے؟؟ ہمارے پاس یتامیٰ اور مساکین و غرباء کی وقتی امداد و ضرورتوں کو پورا کرنے کا احساس تو پایا جاتا ہے لیکن مستقل کفالت کا تصور ناپید ہے!! زکوٰۃ کے مصرف میں سب سے پہلے اپنے اقربا کا خیال کیا جائے گا لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ سال میں ایک بار کسی رشتہ دار کو زکواۃ کے نام پر کچھ دے دیا جائے تو کافی ہے باقی سال بھر اس کی پریشانیوں، مصیبتوں، تعلیم و تربیت، نان نفقے سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ وقتی ضرورت کے نام پر کسی کو دو وقت کی روٹی دینا، کچھ پیسے دینا اسے معاشرے کا ذمہ دار شہری اور نیک سیرت نہیں بنا سکتا، اب تک اس تحریر میں یتامی و مساکین کی کفالت پر خصوصی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ معاشرے میں کچھ اور قسم کے لوگ وہ ہیں جن کی کفالت نہ کی جائے تو معاشرے میں بگاڑ اور اخلاقی انارکی بہت تیزی سے پھیلنے کے امکانات ہوتے ہیں اور وہ ہیں، بیوہ اور طلاق شدہ خواتین۔ قرون اولی میں بہت کم عورتیں ایسی ملیں گی جو بیوہ اور مطلقہ ہونے

کے بعد اپنے گھر بیٹھی رہیں۔ان کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے دوسرے نکاح کرادیے گئے۔

آج ہندووَانہ معاشرتی زنجیروں اور رسم و رواج کی بھینٹ چڑھ کر بہت بڑی تعداد میں مسلم لڑکیاں ایسی ہیں جن کے نکاح جلدی نہیں ہوپاتے اوراس کے بعد بیوہ اورطلاق شدہ عورتیں ہیں جن کے گھر بچے بھی ہوتے ہیں اور ان کی تعلیم وتربیت اور بہتر پرورش بڑا مسئلہ رہتا ہے۔ اپنے گھر والے جس میں بیوی بچے شامل ہیں پر خرچ کرنا بھی صدقہ اور کفالت میں آتا ہے، اسی لیے کسی بیوہ کو سہارا دینا یا ان سے نکاح کرنا افضل کفالت کے درجے میں شمار ہوگا۔جس کے لیے پہلے نکاح میں ہی کسی بیوہ یا مطلقہ کو لانا ضروری نہیں انہیں نکاح ثانی کے ذریعے سہارا دینا چاہیے۔جس معاشرے کا ہم حصہ ہیں وہاں دوسرے نکاح کا تصور تو درکنار اسے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس کے لیے فضا تیار کرنی پڑے گی کیوں کہ ہم اگر اس فضا کو تیار نہیں کرینگے اور محفوظ چھت کے نیچے ستم رسیدہ اور پریشان حال خواتین کی ضروریات پوری نہیں ہونگی تو وہ ساری اخلاقی پابندیوں اور صالح معاشرتی اکائیوں کو پھلانگ کر خود بھی گناہ کا شکار ہونگی اور معاشرہ بھی پراگندہ ہوگا۔

یتامیٰ اور مساکین کی کفالت پر قرآن کریم میں کل ۲۳ مقامات پر ہدایت کی گئی ہے۔کفالت کی ضرورت واہمیت کو واضح کرنے کے بعد اس باب میں وارد احادیث پر بھی ہمیں نظر ڈال لینی چاہیے تاکہ کفالت کے فضائل کا ہمیں ادراک ہوسکے۔رسول اللہؐ نے فرمایا:

"میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ان دونوں کی طرح ہوں گے اور آپ نے اپنی شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کیا"۔(1918،ترمذی شریف)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس شخص نے تین بچیوں کی کفالت کی، انہیں ادب، تمیز وتہذیب سکھائی (حسن معاشرت کی تعلیم دی) اور ان کی شادیاں کردیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔" (سنن ابوداؤد۔5147)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"بہترین گھر وہ ہے، جہاں یتیم ہو اور اس کے ساتھ نیکی کی جاتی ہو اور بدترین گھر وہ ہے جہاں یتیم ہو اور اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا جاتا ہو۔" (ابن ماجہ)

●●●

***

ایک چمن اگر مالیوں کی نگہداشت سے محروم ہوگیا ہو یا جو اس کے مالی ہوں ایک مدت سے اس کی صفائی، اس کے درختوں کی کانٹ چھانٹ، اس کی خودرو گھاسوں کے استیصال، اس کے ننھے پودوں کی دیکھ بھال کے بجائے جنگلی گھاسوں اور درختوں ہی کو چمن کے اصلی پودے سمجھ کر ان ہی کو پانی دینے اور ان ہی کی تربیت کرنے لگ گئے ہوں تو اس چمن کا جنگل بن جانا ایک قدرتی بات ہے۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی صحیح مثال یہی ہے۔وہ ایک قدرتی فرض ہے، جو ایک کسان اپنے کھیت میں، ایک مالی اپنے چمن میں، ایک باغبان اپنے باغ میں، ایک ہادی اپنی قوم میں، ایک امت کے ارباب حل وعقد اس امت کے اندر انجام دیتے ہیں اور نظام خلافت اسی فرض کی ادائی کے لئے ایک قدرتی اور فطری نظام ہے۔اس کے بغیر نہ مسلمانوں کا صحیح نہج پر قائم رہنا ممکن ہے اور نہ اس کے بغیر دنیا پر دین کی حجت تمام ہوسکتی ہے۔پس آج نہ مسلمانوں کا صراط مستقیم سے انحراف قابل ملامت ہے نہ خلق خدا کی ضلالت قابل سرزنش ہے۔مسلمان اس سرزمین کے لئے نمک تھے جب ان کی نمکینی خود جاتی رہی تو اب کوئی چیز نمکین کس چیز سے بنائی جائے گی۔

پس آج جو جماعت مسلمانوں میں توحید اور اس کے مقتضیات کی دعوت کے لیے اٹھے وہ انتہائی حد تک بے رحم ہوگی اگر وہ یہ فرض کرکے اٹھے کہ یہ سارے کے سارے مسلمان کافر و بے دین ہوچکے ہیں۔اگر وہ ایسا کرے گی تو اپنے اس طرزِ عمل سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچائے گی کہ نہ اسے حالات کا صحیح اندازہ ہے اور نہ انبیاء کرام کے طریق دعوت سے اسے کوئی مس ہے، کسی کے کفر وفسق کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ کتابِ الٰہی کی اچھی طرح وضاحت کرے اور ایک صالح جماعت کے قیام کے لیے اپنی پوری جدوجہد صرف کردے۔یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس ظلمت کو دور کردے، جو ہر طرف چھائی ہوئی ہے اور حق و باطل کا امتیاز ہر طالب حق کے لیے آسان ہوجائے۔

(مولانا امین احسن اصلاحیؒ)

قسط نمبر ۸

ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی

مختار احمد مکی

تبدیلی مذہب:

ہندوؤں کو مسلمانوں سے متنفر کرنے کے لیے دوسرا حربہ بزورِ قوت تبدیلیٔ مذہب اور شادی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی واضح اکثریت بنیادی طور پر ہندوستانی ہے لیکن ان مورخوں کے نزدیک اسلام کی اشاعت تلوار اور قرآن کا کارنامہ ہے۔ اگر طاقت اور حکومت کے ذریعہ تبدیلیٔ مذہب کی پالیسی اپنائی جاتی تو سات صدی کے دورِ حکومت میں پورا ہندوستان مسلمان ہو چکا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اسلام صوفیائے کرام کے ذریعہ ہندوستان میں پھیلا لیکن عموماً صوفیائے کرام کو ایک ہندو کے قبولِ اسلام سے اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنا کہ ایک مسلمان کے ترکِ گناہ سے ہوتی تھی۔ اسپین پر آٹھ سو سال تک مسلمانوں کی حکومت کے باوجود ۱۴۹۱ء میں از بلا (Isbella) اور فرڈیننڈ (Ferdinand) نے عیسائی حکومت قائم کی تو وہاں کی ایسی کایا پلٹ کر دی کہ آج قسم کھانے کو بھی کوئی مسلمان نہیں ملتا ہے۔ تیرہ لاکھ بے ضرر اور امن پسند مسلمانوں کو معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے صرف اس وجہ سے آگ میں ڈال کر زندہ جلا دیا گیا کہ وہ گنہگار اور بد دین قوم ہیں اور عیسائی نہیں ہیں جب کہ اسی زمانہ میں سکندر لودھی ہندوستان میں ہندوؤں کو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مامور کر رہا تھا۔

ہندو آبادی کو مسلمانوں سے برگشتہ کرنے کے لیے نت نئی من گھڑت داستانیں تحریر کی گئیں جب کہ بہت سے سیاسی وسماجی واقعات کو نظر انداز کیا گیا۔ مگدھ ریاست کا حکمراں بمبسار بدھ مت سے بے انتہا متاثر تھا تو اس کے بیٹے اجات شترو نے اس کو جان سے مار کر مگدھ کی حکومت ہتھیالی۔ بودھ ذرائع کے مطابق اشوک اعظم نے اپنے ۹۹ بھائیوں کو مار کر گدی حاصل کی۔ سوویں اور سب سے چھوٹے بھائی تش کو پہلے تو زندہ چھوڑ دیا لیکن بعد میں حکومت پر قبضہ کرنے کا الزام لگا کر اسے بھی ختم کرا دیا۔ کلنگ کی جنگ میں ایک لاکھ افراد قتل ہوئے اور ڈیڑھ لاکھ لوگ قید کر لئے گئے۔ اشوکاودان کے مطابق اشوک نے بدھ مٹھوں میں رہنے والے تمام مذہبی پیشواؤں کے قتل عام کا حکم جاری کیا کیونکہ وہ سب تارکِ مذہب ہو گئے تھے۔ ایک بار حرم سرا کی عورتوں نے اس کی بدصورتی کا مذاق اڑایا تو پانچ سو عورتوں کو زندہ جلوا دیا۔ ایک سات سالہ بھکشو نے اشوک کو بودھ بنایا تو اس کے کہنے پر اس نے بدھ دھرم کی مخالفت کرنے والے برہمنوں کو قتل کروا دیا۔ اسی طرح موریہ سلطنت کے برہمن سپہ سالار پشیہ مترشنگ نے آخری موریہ بادشاہ ورہدرتھ کو جان سے مار کر شنگ خاندان کی بنیاد ڈالی۔ برہمن مذہب کی ترقی کے لیے نہ صرف بدھ وہاروں اور عبادتخانوں کو تباہ و برباد کیا، بے شمار بدھوں کا قتل عام کروایا بلکہ اس کا ایک فرمان تھا کہ کوئی بھی بدھ بھکشو کا سر کاٹ کر پیش کرے گا تو فی سر سونے کا سکہ انعام پائے گا۔

جہاں تک جبری تبدیلی مذہب کا تعلق ہے تو شری رام شرما نے اپنی کتاب ''مغل شاسکوں کی دھارمک نیتی'' میں مختلف ذرائع سے اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں قبولِ اسلام کے سلسلہ میں

جو کچھ نام معلوم کئے ہیں اس کے مطابق ۱۶۶۷ء میں رشوت خوری کے الزام میں چار ہندو قانون گویوں کو ان کے عہدہ سے معزول کر دیا گیا۔ سزا پانے کے خوف سے ان لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ۱۶۸۱ء میں منوہر پور کے زمیندار دیوی چندر نے اس لالچ میں اسلام قبول کرلیا کہ اسے ۲۵۰ فوجیوں کے بجائے ۴۰۰ کا منصب دار بنادیا جائے گا۔ ۱۵؍جنوری ۱۷۰۴ء کو راجہ اسلام خان نے ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا تاکہ اپنی بہن کی شادی اورنگ زیب کے بیٹے سے کر سکے لیکن یہ شادی نہیں ہوسکی۔

تاریخ کے ساتھ کھلواڑ کیسے؟

پروفیسر بشمبر ناتھ پانڈے نے اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر تاریخ کے مسخ کرنے کے واقعات کو یوں بیان کیا ہے کہ:

ایک بار الہ آباد کے قیام کے دوران کالج کے کچھ طلبہ تاریخ کے ایک انجمن کے قیام کے سلسلہ میں ان سے ملنے آئے۔ چونکہ یہ طلبہ کالج سے براہِ راست آرہے تھے اس وجہ سے ان کے ہاتھوں میں تاریخ کی کچھ نصابی کتابیں تھیں۔ دورانِ گفتگو وہ یونہی ان کے کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگے جس میں یہ تحریر تھا کہ تین ہزار برہمنوں نے ٹیپو سلطان کے ظلم و زیادتی اور تبدیلیٔ مذہب کے خوف سے خودکشی کرلی، وہ چونکے۔ انہوں نے کتاب کے مصنف مہاپادھیہ ڈاکٹر ہر پرشاد شاشتری (صدر شعبۂ سنسکرت، کلکتہ یونیورسٹی) کو ان معلومات کا ماخذ جاننے کے لیے ایک خط لکھا۔ بار بار کی یاد دہانی کے بعد انہیں جواب ملا کہ یہ باتیں میسور گزٹ سے لی گئیں ہیں۔ میسور گزٹ تو الہ آباد میں تھا اور نہ ہی کلکتہ کی ایمپریل لائبریری میں۔ اس وجہ سے انھوں نے میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہری چندر ناتھ سیل سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے ان کا خط اپنے نوٹ کے ساتھ میسور گزٹ کے ایڈیٹر شری کانتیہ کو بھیج دیا۔ شری کانتیہ نے پروفیسر پانڈے کو جواب دیا کہ میسور گزٹ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے اور میسور کی تاریخ کے طالب علم ہونے کے ناطے ان کے علم میں ایسی کوئی بات کبھی آئی بھی نہیں۔ شری کانتیہ نے انھیں یہ بھی لکھا کہ ٹیپو سلطان کا وزیر اعظم اور فوج کا سپہ سالار پرنیا اور کرشن راؤ دونوں ہی برہمن تھے۔ مزید یہ کہ اس نے ۱۵۶ مندروں کی ایک فہرست بھی بھیجی جس کو ٹیپو سلطان سالانہ عطیات دیا کرتا تھا۔ ساتھ ہی شرنگا پٹنم مندر کے جگ گرو شنکر اچاریہ کے نام بھیجے گئے ۳۰ خطوط کی کاپیاں بھی بھیجی جو اکثر عقیدت میں ٹیپو سلطان ان کو لکھا کرتا تھا۔

ڈاکٹر شاشتری کی یہ کتاب بنگال، بہار، اڑیسہ، آسام، یوپی، ایم پی اور راجستھان کے اسکولوں کے نصاب میں شامل تھی۔ ڈاکٹر بی این پانڈے نے ان تمام خطوط کی نقل کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر آسوتوش چودھری کو روانہ کردی تاکہ وہ ان الزامی جملوں کے سلسلہ میں ضروری اقدام اٹھاسکیں۔ وائس چانسلر نے انھیں فوری طور پر جواب دیا کہ شاشتری کی کتاب نصاب سے نکال دی گئی ہے۔ لیکن پانڈے جی نہایت افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ وہ ساری باتیں یوپی کے ہائی اسکول کے نصاب میں دس سال بعد بھی دیکھنے کو ملیں۔

ٹیپو سلطان کے سلسلہ میں محمود خاں اپنی کتاب ''تاریخ سلطنت خداداد'' میں تحریر کرتے ہیں کہ میسور کی تیسری جنگ میں انگریز، نظام اور مرہٹوں کی مشترکہ افواج نے سلطنت خداداد پر حملہ کیا۔ مرہٹہ افواج نے جہاں عام لوٹ مار میں حصہ لیا وہیں ہندوؤں کے مقدس مقام سری نگر کو بھی تاراج کیا۔ مندر کے مہنت نے ٹیپو سلطان کو لکھا کہ:

''مرہٹی افواج نے شاردا دیوی کے مندر کو انتہائی نقصان پہنچایا ہے۔ پرتیما کو اٹھا کر اس کی جگہ سے دور پھینک دیا۔ مندر کے ہاتھی اور گھوڑے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ مندر کا منجملہ ساٹھ لاکھ کا نقصان ہوا ہے۔''

اس کے جواب میں ٹیپو سلطان نے دوسو راحتی (اشرفی) نقد اور دوسو راحتی کے قیمت کا اجناس فوراً روانہ کیا اور انھیں خط لکھا کہ دیہات سے جن چیزوں کی انھیں ضرورت ہو وہ لے لیں۔ اس رقم اور اجناس سے شاردا دیوی کے بت کو دوبارہ نصب کرائیں اور برہمنوں کو کھانا کھلائیں۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر تھا کہ وہ لوگ جو ان مقدس مقامات کی بے حرمتی کرتے ہیں یقین ہے کہ انھیں بہت جلد اپنے کرتوتوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا..... آپ کی ذات تقدس مآب تارک الدنیا ہے اس لیے آپ کا اور مندر کے دوسرے برہمنوں کا فرض ہے کہ وہ ملک کے دشمنوں کی تباہی کے لیے دعا کریں تاکہ ہمارا ملک محفوظ اور ہماری رعایا خوش حال رہے۔

میسور آرکیالوجیکل سروے کی ۱۹۱۷ء کی ایک رپورٹ میں تحریر ہے کہ میل کوٹ کے مندر

میں سونے اور چاندی کے جو زیورات اور ظروف ہیں ان پر موجود تحریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ٹیپو سلطان کے عطیات ہیں۔ اسی طرح موضع گلالی کے لکشمی کنتا مندر میں ٹیپو سلطان کے عطیہ کئے ہوئے چاندی کے چار پیالے، ایک طباق اور ایک گلدان اب بھی موجود ہیں۔

نواب سراج الدولہ اور انگریز مؤرخین:

مرشد آباد کے نواب سراج الدولہ بھی انگریزوں کے منظور نظر نہیں تھے کیونکہ انھوں نے انگریزی اقتدار، اس کے ظلم و زیادتی اور استحصال کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور انگریزوں کو سرزمین ہند سے اکھاڑ پھینکنے کی تمام تر کوششیں کی۔ اس نے بنگال میں مزید قلعہ بنانے اور مورچہ بندی کی بھی سخت ممانعت کر دی تھی۔ حتیٰ کہ ۱۸ جون ۱۷۵۶ء کو فورٹ ولیم پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں کو کلکتہ کی سرزمین سے نکال کر ہی دم لیا تھا۔ اس وجہ سے انگریز مؤرخین نے اس کو بھی نہیں بخشا اور اس کی کردار کشی کی زبردست مہم شروع کی۔ اپنی تمام تر حرکات کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے اس کو بدنام کرنے کے لیے بہت سے افسانے گڑھے جس میں حادثہ بلیک ہول کا نام سرفہرست ہے۔ جے سی مارشین کے مطابق:

> ”کہا یہ جاتا ہے کہ نواب سراج الدولہ کے حکم سے ۱۴۶/ انگریزوں کو جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے ایک ایسی تنگ و تاریک کوٹھری میں قید کر دیا گیا جو فوجی ملزموں کے لیے حوالات کے کام آتی تھیں اور بمشکل بیس مربع فٹ کے رقبہ میں تھی۔ اس میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے محض ایک کھڑکی تھی۔ اسیران دم گھٹنے والی سخت گرمی اور حلق خشک کرنے والی پیاس کی تاب نہ لاسکے اور رفتہ رفتہ ان کی اکثریت موت کے آغوش میں پہنچ گئی۔ جب صبح کو دروازہ کھولا گیا تو صرف ۲۳/ افراد گھسیٹ کر باہر نکالے گئے جو کہ گرچہ زندہ تھے لیکن ان کی حالت مردوں سے بھی بدتر تھی۔“

لیکن آج مختلف تحقیقات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ محض فرضی قصہ تھا اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ڈاکٹر باسواس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ”ہم عصر مؤرخین اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ سیرۃ المتأخرین کا مصنف خاموش ہے۔ مدراس کونسل کے مباحثہ میں اس کا اشارہ تک موجود نہیں۔ علی نگر کے عہدنامہ میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ سراج الدولہ کے تخت سے علاحدگی کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے جو خطوط کلائیو نے بورڈ آف ڈائرکٹرز کو لکھے ہیں ان میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ انگریزوں نے میر جعفر سے جو معاہدہ کیا اس میں بھی بلیک ہول کے حادثہ میں مرنے والوں کے پسماندگان کی اعانت کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ خود کلائیو نے سلیکٹ کمیٹی کے سامنے جو یادداشت پڑھی تھی اس میں بھی اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔“

انگریزی حکومت کو انگریز مؤرخوں نے سیکولر حکومت کے طور پر پیش کیا ہے جب کہ ان کی کتابوں میں ہندوستانی حکمرانوں کی مذہبی پالیسی پر بحث کی گئی ہے۔ خود انگریزوں کو مذہب سے اوپر رکھتے ہوئے صرف ان کے سماجی، سیاسی اور معاشی پہلو پر گفتگو کی ہے۔ جنگ کے دوران اگر کسی ہندو مندر کو اتفاقی طور پر نقصان پہنچا تو اسے مسلم حکمرانوں کے ذریعہ ارادتاً برباد کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی سازش یا بغاوت کے دوران مسلمان حکمرانوں کی جانب سے اسے سختی سے دبا دیا گیا تو یہ بھی اس کی ظالمانہ پالیسی مانی گئی اور یہی کام جب انگریزوں کے ذریعہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی یا مختلف جنگوں کے دوران کیا گیا تو اسے بغاوت کو کچلنے کا نام دیا گیا۔ جب اورنگ زیب نے راجپوت، مراٹھا، جاٹ یا سکھ سردار کے خلاف سیاسی بنیادوں پر یا نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لیے جنگ کی تو یہ اورنگ زیب یا دوسرے مسلم بادشاہوں کے ذریعہ ہندو عوام کے ساتھ ظالمانہ مذہبی پالیسی قرار دی گئی۔

جزیہ:

ہندو اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز اور تفرقہ پیدا کرنے کے لیے ان مؤرخوں نے جزیہ کو بھی موضوع بنایا ہے اور اسے مسلمان بادشاہوں کی جانب سے ہندو عوام پر لگایا گیا مذہبی ٹیکس قرار دیا گیا۔ اس کو اس طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ جو ٹیکس لگاتا ہے وہ متعصب ہے اور وہ رعایا کے مذہب کو بدل سکتا ہے، مذہبی ادارے کو تباہ کر سکتا ہے اور یہ غیر رواداری کی مثال ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا محصول ہے

جس کی اجازت خود شریعت دیتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے مطابق مسلم حکومت میں غیر مسلم اگر اسلام کی بالادستی اور اقتدار کو قبول کر لیتا ہے تو اسے ذمی کہا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ:

"ذمی کا خون ہمارا خون ہے، ان کا خون بہانا ہمارا خون بہانا ہے۔"

خود ارشاد نبویؐ ہے:

"خبردار، جس نے کسی ذمی پر ظلم کیا یا اسے نقصان پہنچایا یا اس سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لیا یا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے کوئی چیز لی تو قیامت کے دن میں اس کی طرف سے احتجاج کروں گا۔ ان ذمیوں کا خون تمہارے (مسلمانوں) خون کی طرح ہے۔"

اس طرح مسلمانوں کی حکومت میں ذمی مسلمانوں کی حفاظت میں ہوتے ہیں۔ سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی نقطۂ نظر سے ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری مسلم حکومت کی ہوتی ہے۔ ان سب کے بدلہ حکومت ان سے ایک محصول وصول کرتی جو ان کے جان و مال کے تحفظ کی ضمانت ہوتی ہے۔ غیر مسلم سرکاری اہل کار، عہدہ دار (عمّال)، فوجی، عورتیں، بچے، اپاہج، اندھے، غریب، معذور، پجاری، فقیر اور قحط، سیلاب یا دوسری قدرتی آفات سے متاثر علاقہ کے ساکن جزیہ کی اس رقم سے مستثنیٰ ہوتے۔ اس طرح بمشکل دس فیصد مالدار ہندوؤں کو اوسطاً ڈھائی فیصد آمدنی بطورِ جزیہ دینا پڑتا۔ اتنی ہی رقم مسلمانوں کو بطور زکوٰۃ ادا کرنی پڑتی۔ اس کے علاوہ انھیں صدقات اور بوقت ضرورت بڑے بڑے چندے اور عطیات بھی ادا کرنے پڑتے اور جبری فوجی خدمات بھی انجام دینی پڑتی ہیں۔ کسی بھی حالت میں ان سے زکوٰۃ کی رقم معاف نہیں ہوتی۔ ابتدا میں برہمن بطورِ پجاری و عالم اس ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دئے گئے لیکن فیروز شاہ اور اورنگ زیب کو جب یہ احساس ہوا کہ تمام برہمن صرف اپنی پیدائش کے باعث عالم یا پروہت نہیں ہیں تو ان کے تندرست نوجوانوں کو فوجی خدمات کے لیے بلایا جانے لگا۔ ذات پات کی بندش کے باعث وہ چھتریوں کی صف میں بھی نہیں آنا چاہتے تھے اور خود کو ٹیکس سے مبرا بھی سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اسے ہندو ٹیکس کا نام دیا جو ہندو ہونے کی وجہ سے صرف انھیں ہی ادا کرنا پڑ رہا ہے اور مسلمان اس سے بچے ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا جسے حکومت ان سے وصولتی ہے۔ مولانا آزاد کا کہنا ہے کہ:

"اسلام نے مسلمانوں پر جنگی خدمت فرض کی ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں جبری فوجی خدمت کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ جو غیر مسلم اسلامی حکومت کے ماتحت شہری زندگی بسر کریں وہ بھی ملک کی حفاظت کے لیے جنگ میں شامل ہوں۔ لیکن اسلام اسے انصاف کے خلاف سمجھتا ہے کہ اس بارے میں غیر مسلموں پر جبر کیا جائے۔ اس لیے یہ ان کی مرضی پر تھا کہ وہ اپنی خوشی سے جنگ میں شامل ہوں ورنہ اس کے بدلے ایک سالانہ رقم ادا کر دیا کریں جو جزیہ کہلاتی ہے اور جو بقدر زکوٰۃ تھی جسے مسلمان ادا کرتے تھے۔"

ڈاکٹر تاراچند کے لفظوں میں:

"اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے تیرھویں سال میں سلطنت کی آمدنی و اخراجات کا حساب کیا تو ریاست کا خرچ آمدنی سے کہیں زیادہ تھا جس کا اثر شاہی خزانہ پر غالب تھا۔ اس لیے اس نے جزیہ ادا کرنے کا حکم جاری کیا جو کہ اکبر کے بعد کے سالوں سے منقطع ہو گیا تھا.... یہ ایک معمولی رقم تھی۔ مسلمانوں کو زکوٰۃ اور صدقہ دو ایسے ٹیکس ادا کرنے پڑتے جن سے ہندو محفوظ تھے اور یہ جزیہ کی رقم سے کہیں زیادہ ہوتے تو یہ ٹیکس غیر منصفانہ نہیں معلوم ہوتے۔ مسلمانوں کو شاہی خزانے میں اکثر اپنی آمدنی کا ڈھائی فیصد اور بعض اوقات ساڑھے بارہ فیصد تک ادا کرنے پڑتے لیکن غیر مسلموں کو سال میں پانچ دینار سے زیادہ نہیں دینا پڑتا اور اس کے بدلے وہ جنگی خدمت یعنی جہاد سے آزاد تھے۔ جزیہ کی یہ رقم بالعموم برہمن ہی وصول کرتے اور غریبوں سے وصول کرتے ہوئے اس کا خاص طور پر دھیان رکھا جاتا۔"

لیکن انگریز مؤرخین نے اسے ہندو ٹیکس قرار دیتے ہوئے مذہبی خول عطا کیا اور اپنی پالیسی کے تحت اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

(جاری ہے.....)

●●●

ولاء اور براء

(محبت اور نفرت کا اسلامی فلسفہ)

ابو صدف مدنی

اسی طرح جب کوئی انسان اپنی سب سے قیمتی متاع اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہے تو اس کے اس عمل میں محبت اور کراہت دونوں مجتمع ہوجاتی ہیں۔ وہ فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مال کو روکنا چاہتا ہے اور شریعت کے تقاضے سے اسے خرچ کرنا چاہتا ہے۔ قرآن نے اس فطری پہلو کو کئی جگہ ابھارا ہے:

لَن تَنَالُواْ الْبِرَّ حَتَّى تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللّهَ بِهِ عَلِيمٌ.

(آلِ عمران: ۹۲)

''تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو، اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہیں ہوگا۔''

وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّآئِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ (البقرۃ: ۱۷۷)

''اور اُس نے اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کیا۔''

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً (الدھر: ۸)

''اور مال کی محبت کے باوجود مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔''

بعض حضرات نے یہ نکتہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ محبت ہو کہ نفرت، یہ دل کا کھیل ہے۔ دل اپنے آپ کسی سے محبت کرتا ہے اور کسی سے نفرت کرنے لگتا ہے، اس میں انسان کا حیلہ یا تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ اس لیے کافروں سے محبت اگر کسی کو ہوجائے تو وہ معذور اور قابل معافی ہے۔ اس بات کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ نکلے گا کہ محبت اور نفرت کے معاملے کو شرعی تکالیف کے دائرے سے باہر کر دیا جائے اور نتیجتاً اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ایمان کی بنیاد پر کسی سے نفرت یا محبت کرنے کے جو احکام دیے ہیں ان سب کو لغو مان لیا جائے۔ چنانچہ وہ تمام شرعی نصوص جن میں کبھی اللہ سے محبت، کبھی رسول ﷺ سے محبت، کبھی انصارؓ سے محبت، کبھی اہلِ بیتؓ سے محبت اور کبھی اولیاء اللہ سے محبت کا حکم دیا گیا ہے وہ سب عبث اور لاحاصل ہیں جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں کیونکہ محبت یا نفرت تو دل کا تصرف ہے جو خود بہ خود ہوجاتا ہے، انسان کا اس بارے میں کوئی اختیار نہیں چلتا۔ حالانکہ مشہور یہ ہے ایمان کا اعلیٰ درجہ وہی ہے جسے محبوبِ کبریا حضرت محمد ﷺ نے یوں بیان فرمایا تھا کہ ''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اسے اس کے والد اور اولاد اور دیگر تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔'' لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من والده وولده والناس اجمعين (صحیح بخاریؒ: ۱۴)

اب اگر کوئی شخص آ کر کہے کہ جناب محبت دل کا معاملہ ہے جس پر انسان کا بس نہیں چلتا، میں کیا کروں کہ میرے دل میں اللہ کے نبیؐ کی محبت پیدا نہیں ہوتی، یا اتنی نہیں ہے جتنی کہ مجھے اپنی اولاد اور والدین سے ہے۔ کیا از روئے شرع اس کی یہ بات قابل قبول ہوگی؟ حضرت عمرؓ نے دربارِ رسالت ﷺ میں ایک مرتبہ اس سے کافی ہلکے درجے کی بات فرمائی تھی، مگر اللہ

کے رسول ﷺ نے ان کی بات تسلیم نہیں کی، بلکہ محبت اور نفرت کے تعلق سے انہیں اپنا فہم ٹھیک کر لینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت عمرؓ کا ایمان ترقی کر گیا۔ صحیح بخاریؒ میں ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے فرمایا تھا: اللہ کے رسولؐ، آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میری اپنی ذات کے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''یہ ناقابل قبول ہے، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس وقت تک تمہارا ایمان مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ میں تمہیں تمہاری جان سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔'' اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''اگر یہ بات ہے تو اب اللہ کی قسم، آپؐ کی ذات مجھے اپنی جان سے زیادہ محبوب ہو گئی ہے۔'' یہ سننے کے بعد آپ ﷺ کی زبان سے نکلا تھا: ہاں اب، اے عمرؓ۔'' (یا رسول اللہ لأنت أحب إلی من کل شیئ إلا من نفسی فقال النبی ﷺ لا والذی نفسی بیدہ حتی أکون أحب إلیک من نفسک فقال لہ عمر فإنہ الآن واللہ لأنت أحب إلی من نفسی فقال النبیؐ الآن یا عمر)

(صحیح بخاری: ۶۶۲۳ عن عبداللہ بن ہشامؓ)

حضرت عمرؓ کو جب معلوم ہوا کہ مومن کے دل میں رسولِ کریم ﷺ کی محبت اپنی جان کی محبت سے زیادہ ہونی چاہیے کیونکہ یہی ایمان کا تقاضا ہے، تو انہوں نے مجاہدہ کیا اور اس محبت کے درجے کو حاصل کر لیا۔ اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ محبت ہو یا نفرت، یہ مجاہدے اور ریاضت سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ تو ہے کہ جب کچھ لوگوں نے اسلام کے بعض احکام و تشریعات کو دینی عناد اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رویے کو ارتداد اور خروج عن الاسلام کے ہم معنی قرار دیا اور یہ نہیں فرمایا کہ ان بے چاروں کو عام معافی ہے کیونکہ محبت اور نفرت دلوں کا معاملہ ہے اور اس پر انسان کا زور نہیں چلتا۔ ارشاد ہوا تھا:

ذٰلِکَ بِأَنَّھُمْ کَرِھُوا مَا أَنزَلَ اللہُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَھُمْ (محمد: ۹)

''کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے، لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔''

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ کفار و مشرکین میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمارے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرتے ہیں، ایسے میں جب کہ وہ ہمارے محسنین ہیں ہم کیسے ان سے نفرت کر سکتے ہیں، کوئی بھی سلیم الفطرت ایسا نہیں کرتا کہ اپنے محسن کو نہ چاہے۔ محسن سے محبت کرنا ایک فطری داعیہ ہے جس سے انسان بہ مشکل انحراف کر پاتا ہے۔ اس قسم کا اعتراض کرنے والے دراصل یہ بھول جاتے ہیں کہ محبت اصلاً محبوب کے اعمال کا ردِ عمل ہے اور نفرت مبغوض کے اعمال کا ردِ عمل ہے۔ کسی کافر نے آپ کو مال دیا، ہدیہ دیا اور مسکرا کر ملاقات کی تو احسان کیا، مگر اس نے خالق حقیقی کے تئیں کفر و الحاد کی روش اختیار کر کے بڑی برائی کا ارتکاب کر رکھا ہے۔ اللہ رب العالمین ہمیں ہماری اپنی ذات سے زیادہ عزیز اور مکرم ہونا چاہیے۔ اس لیے اس شخص کی برائی (شرک و کفر) جو ربِ حقیقی کے تئیں وہ کر رہا ہے اس کے اس مادی احسان و کرم سے ہزار گنا زیادہ ہے جو وہ ہمارے ساتھ کر رہا ہے۔ اس سے پہلوتہی کی صورت یہی ہے کہ ہم اپنی ذات کو اللہ کی ذات سے بڑھا ہوا اور قیمتی جانیں اور یہ سمجھنے لگیں کہ جو شخص ہمارے ساتھ برا کرے وہ تو نفرت کا مستحق ہے اور جو شخص ہمارے ساتھ احسان کرتے ہوئے ہمارے رب کے ساتھ برا کرے وہ محبت کا مستحق ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا سوچتا بھی ہے تو وہ گویا اپنے آپ کو اللہ پر فوقیت دے رہا ہے اور یہ ایسی شنیع و قبیح بات ہے جس کا تذکرہ بھی قلم پر بھاری ہے۔

امام تاج الدین سبکیؒ نے اپنے فتاویٰ میں اس مفہوم کی طرف بڑا بلیغ اشارہ کیا ہے۔ لکھا ہے:

''بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ پاکیزہ اور سلیم الفطرت نفوس کسی سے نفرت یا عداوت کسی وجہ سے کرتے ہیں؛ یا تو کسی ایسے عمل کی بنیاد پر جس کا نقصان براہِ راست انہیں پہنچا ہو، یا کسی ایسی ذات کو پہنچا ہو جسے یہ بے حد چاہتے ہیں یا جو انہیں بے حد چاہتا ہے۔ اسی باب سے کفار سے ہماری عداوت ہے کیونکہ یہ لوگ اُس ذاتِ عالی کی بے حرمتی کی جسارت کر رہے ہوتے ہیں جو ہمیں ہماری جانوں سے زیادہ عزیز اور محبوب ہے۔''

(والذی یظھر أن النفوس الطاھرۃ السلیمۃ لا تبغض أحدا ولا تعادیہ إلا بسبب إا واصل إلیھا أو إلی من تحبہ أو یحبھا ومن ھذا الباب عداوتنا للکفار بسبب تعرضھم إلی من ھو أحب إلینا من أنفسنا) (فتاوی تاج الدین السبکی: ۲/۴۷۶)

اب اگر کوئی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے محسنین کفار سے نفرت کروں یہ مجھے زیب نہیں دیتا۔تو اس سے ہم کہیں گے کہ جناب اصلاً آپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ آپ کسی ایسے کافر سے محبت کا دم بھریں جس نے آپ کے معبودِ حقیقی کے ساتھ برا کیا ہے،صرف اس بنیاد پر کہ اس نے آپ کی طرف دنیا کے چند ٹکڑے پھینک دیے ہیں۔آپ کے خالق حقیقی کے احسانات وانعامات کے مقابلے میں اس کافر کے احسان کی حیثیت پرِ کاہ کیے برابر بھی نہیں ہے۔بلکہ سرے سے رب کی نعمتوں میں جو اس نے آپ کو بخشی ہیں اور کافر کے پھینکے چند ٹکڑوں اور ٹکوں میں کوئی نسبتِ تقابل ہی نہیں پائی جاتی۔

بہرحال ایمان والا کوئی بھی شخص اگر اپنے ذہن میں یہ استحضار کرلے کہ کافر نے اللہ کو معبود نہ مان کر اور محمد ﷺ کو اپنا رہنما اور نبی نہ مان کر میرے رب کی بے عزتی اور بے حرمتی کی ہے،پھر بھی اس کے دل میں دینی غیرت کی بنیاد پر اس سے تنفر کا جذبہ پیدا نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا دل مردہ ہو چکا ہے اور اب اسے اپنے دل کا ماتم کرنا چاہیے،کیونکہ دل اگر زندہ ہو تو وہ کبھی اس پر راضی نہیں ہوسکتا کہ اس کے خالق وما لکِ حقیقی کے ساتھ کوئی برا کرے۔اس پر کوئی اگر راضی ہوسکتا ہے تو صرف وہ شخص جو کفر واسلام کے فرق کو محض نقطۂ نظر کا اختلاف قرار دیتا ہے اور مانتا ہے کہ اس پر اللہ کی رضا یا ناراضی موقوف نہیں ہے۔

کچھ خوش اندیش یہ بھی کہتے ہیں کہ دین کی بنیاد پر ہم بھلا کسی سے نفرت یا محبت کیسے رکھ سکتے ہیں کیونکہ بہت ممکن ہے کہ وہ اندرونی طور سے ویسا نہ ہو جیسا کہ وہ باہر سے نظر آتا ہے۔دوسرے لفظوں میں کسی کو کافر کیسے مان لیا جائے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ درونِ خانہ مسلمان ہو۔ان صاحب سے کہا جائے گا کہ دیکھیے محبت ہو یا نفرت،یہ ہمارے گھر کی چیز نہیں ہے،بلکہ شریعت نے ہمیں ان جذبوں کے استعمال کا حکم دیا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ شریعت کے احکام ظاہری حالت سے متعلق ہوتے ہیں۔اس لیے محبت یا نفرت کا یہ شرعی حکم جب کوئی شخص نافذ کرے گا تو جن پر بھی وہ نافذ کرے گا ان کے بارے میں کچھ اور ہونے کا امکان باقی رہے گا۔ایسے میں گویا اس حکم کی عملی تطبیق انسان کے اجتہاد پر چھوڑ دی گئی ہے جس میں انسان درست بھی ہوسکتا ہے اور غیر صحیح بھی۔تاہم اس کی نادرستی یا غلطی معاف ہوگی۔

اسی لیے امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے:

''نفرت ومحبت میں اور موالات ومعادات میں لوگ اپنی صواب دید سے اجتہاد کرتے ہیں،کبھی درست ثابت ہوتے ہیں اور کبھی غلطی کر جاتے ہیں۔'' [ثم الناس فی الحب و البغض والموالاة و المعاداة هم أيضا مجتهدون يصيبون تارة ويخطئون تارة]

(مجموع الفتاوی:۱۱/۱۵)

امام لالکائیؒ کی روایت کے مطابق اس نکتے کی طرف امام محمدؒ بن حنفیہ نے کافی پہلے متوجہ کر دیا تھا۔ان کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے اس لیے نفرت کرتا ہے کیونکہ اس نے اس کے ہاتھوں کسی پر ظلم ہوتے دیکھا تھا،حالانکہ اللہ کے علم کے مطابق وہ شخص بہ باطن جنتی تھا،تب بھی اس سے نفرت کرنے والے کو اللہ اجر سے نوازے گا،یہ مان کر کہ گویا اس نے ایک دوزخی ظالم انسان سے نفرت کی تھی۔'' [من أبغض رجلا على جور ظهر منه وهو في علم الله من أهل الجنة أجره الله كما لو كان من أهل النار] (شرح اعتقاد اہل السنۃ، لالکائی، تحقیق: احمد سعد حمدان:۴/۶۹۰)

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کفار سب ایک درجے پر تھوڑے ہی ہیں،پھر کیسے انہیں قلبی نفرت میں یکساں مان لیا جائے؟ یہ بھی غلط بات ہے۔اہلِ سنت والجماعت کے ائمہ میں سے کسی امام نے کبھی یہ فتویٰ نہیں دیا کہ دشمنی میں تمام کفار یکساں ہیں۔کفر فی نفسہ متنوع الدرجات ہے ٹھیک ویسے ہی جیسے کہ ایمان کے مختلف مراتب ہیں۔اسی لیے جیسے بعض اہلِ خیر بندے ایمان میں امامت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں،اسی طرح کچھ اہلِ شر بندے کفر میں بھی امامت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَاماً (الفرقان:۷۴)

''اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنادے۔''

فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ (التوبۃ:۱۲)

''تو کفر کے اماموں سے جنگ کرو۔''

چنانچہ اسی طرح اہلِ ایمان کے دین میں رسوخ اور تشرّع میں کمی بیشی کی وجہ سے ان ساتھ محبت میں بھی کمی بیشی ہوسکتی ہے اور اہلِ کفر کے الحاد وشرک میں تفاوت کی وجہ سے ان کے تئیں دینی نفرت وکراہت میں بھی تفاوت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ ممتحنہ میں اسی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ یاد رہنا چاہیے کہ سورہ ممتحنہ خالصتاً

غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرنے کے آداب واحکام پر مشتمل ایک مدنی سورت ہے۔اس میں ارشاد ہوا ہے:

لاَ يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِيْ الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنة:٨)

''اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

دوسری بات یہ کہ عام مسلمانوں کی جانب سے غیر مسلم حضرات کے ساتھ تاریخ میں، یا ہمارے زمانے میں جس طرح کے طریق ہائے تعامل برتے گئے ہیں، ضروری نہیں کہ انہیں اس سلسلے میں اسلامی منہج کا کامل نمائندہ وترجمان سمجھنا فی نفسہ درست ہی ہو۔حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کے بارے میں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے نقطہ ہائے نظر اور دینی تصورات بڑے متفاوت ومتباین واقع ہوئے ہیں۔کچھ لوگ وہ ہیں جو غیر مسلموں میں کلی اندماج اور کھلے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں جب کہ دوسری کچھ مسلم جماعتیں ایسی ہیں جو مکمل علاحدگی اور پہلوتہی پر زور دیتی ہیں۔کچھ لوگ اس سلسلے میں انقباض وتنگی محسوس کرتے ہیں جبکہ کچھ اور لوگ غیر مسلموں سے تعلق بنانے میں یک گونہ انبساط وفرحت محسوس کرتے ہیں۔مسلمانوں میں ایسی شدت پسند جماعتیں بھی پائی گئی ہیں جو حالتِ جنگ میں حربی کافر اور ذمی ومستامن کافر کے مابین فرق وامتیاز کی روادار نہ تھیں اور سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنے پر عمل پیرا تھیں۔ان کے نزدیک دنیا بھر کے غیر مسلموں کے ساتھ ہمیں تشدد اور سخت گیری برتنے اور ہر معاملہ میں ان سے قطع تعلق کرنے کا حکم دیا گیا ہے، پھر چاہے وہ عام مالی وتجارتی معاملات ہی کیوں نہ ہوں۔

ایسے متشدد گروہ اس سلسلے میں بعض قرآنی آیتوں اور احادیث کو سیاق وسباق سے کاٹ کر اپنا مستدل بناتے ہیں۔مثلاً یہ آیتِ کریمہ:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُم (الفتح: ٢٩)

''محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔'' اور اللہ کے رسول ﷺ کا یہ ارشاد کہ ''یہود ونصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو، اگر تم ان میں سے کسی کو راستے میں پاؤ تو مجبور کردو کہ وہ راستے کے تنگ حصہ سے ہوکر گزرے۔'' [لاتبدئوا اليهود ولا النصارىٰ بالسلام فإذا لقيتم أحدهم في طريق فاضطروه إلىٰ أضيقه] (صحیح مسلمؒ:٢١٦٧)

حالانکہ عمومی حالات وتعلقات کے ضمن میں اس طرح کی آیات واحادیث سے استدلال کرنا غلط ہے۔مسلمانوں میں جس طبقہ کی رائے یہ ہے کہ مطلقاً سختی ودرشتی کے ساتھ غیر مسلموں کے ساتھ پیش آنا چاہیے، انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی یہ رائے دین اسلام کی رواداری وسماحت، عالمیت وجہاں گیری اور اخلاقی بلندی ورفعت سے میل نہیں کھاتی ہے، نیز یہ اللہ کے رسولؐ اور صحابۂ کرامؓ کی سیرت وسنت کے معارض ومنافی بھی ہے۔اللہ کے رسول ﷺ اور صحابۂ کرام نے غیر مسلموں یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے ساتھ جس طرح کا معاملہ برتا ہے وہ سیرت وحدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے اور اس کی روشنی میں اس طرح کی انتہا پسندانہ رائے کا خلافِ اسلام ہونا یقینی بن جاتا ہے۔مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک دینی حقیقت ہے کہ غیر مسلم کفار ومشرکین سے قلبی محبت رکھنا حرام ہے۔ہر مسلمان کو شرک وکفر کی غلاظت سے نفرت ہونی چاہیے اور جو لوگ اس گندگی میں ملوث ہیں ان کے تئیں اُس کے اندر انشراح وانبساط کی کیفیت پیدا ہوجائے تو یہ اپنے آپ میں اس کے ایمانی جذبے پر ایک سوالیہ نشان ہے۔

آج کل دعوتِ دین کے نام پر ایک نئی شریعت گھڑنے کا فیشن چل نکلا ہے۔ایسے ہی کچھ حضرات یہ کہتے ہیں کہ کفار سے نفرت وعداوت کے حکمِ شرعی کو اگر بدل دیا جائے تو اسلام کی نشر واشاعت میں بڑی آسانیاں پیدا ہوجائیں گی اور بڑا دعوتی فائدہ ہوگا۔اس طرح کی بات کہنے والے نتیجہ اُلٹا بیان کرتے ہیں۔کفار سے نفرت وکراہت پر مشتمل نصوص میں اگر تحریف وتلبیس کی جائے گی تو اس سے علمائے اسلام اور داعیانِ دین کی سیرت وکردار پر داغ لگے گا، لوگ کہیں گے کہ دیکھو یہ مسلمان جھوٹے اور دھوکے باز ہیں جو تحریکی اور دعوتی مصالح کی خاطر دین میں تحریف کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے، ان کا دین ان کے لیے بازیچۂ اطفال ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ہر زمانے میں اسلام کی سب سے بڑی خدمت

یہی ہے کہ اس کو سچائی کے ساتھ پورا پورا پیش کر دیا جائے۔ یقیناً اس کی گنجائش ہے کہ کوئی داعی یا عالم شرعی احکام کے نفاذ میں تدریج اور نرمی سے کام لے۔ مگر اس کی گنجائش بالکل نہیں ہے کہ وہ احکامِ شرعیہ میں تحریف شروع کر دے۔ کسی بھی موہوم یا متحقق مصلحت کی خاطر اللہ کے دین کو جاننے والا ایسی جسارت نہیں کر سکتا۔ شریعت کے تدریجی نفاذ و تعلیم میں اور شریعت کے دخل و تحریف میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بعض غرض مند مفکرین اس سلسلے میں اللہ کے نبی ﷺ کے بعض افعال کا سہارا لیتے ہیں اور خلیفہ عمرؒ بن عبدالعزیز کے سیاسی فیصلوں سے استدلال کرتے ہیں تاکہ اس طرح تدریج کو تحریف بنا ڈالیں۔ اس طرح کے مفکرین اصلاً خلطِ مبحث کا شکار ہیں۔ انہیں خود نہیں پتہ کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ چلیے کچھ دیر کے لیے مان لیتے ہیں کہ ہم نے ولاء و براء کے شرعی احکام کا میک اپ کر کے انہیں نئے زمانے کے لیے قابل قبول بنا دیا اور کفار سے نفرت کا درس دینے والی شرعی نصوص میں تحریف کر ڈالی۔ مگر ہم ان قرآنی آیتوں کا کیا کریں گے:

أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلاً (الفرقان: ۴۴)

”کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں، یہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔“

وَأَنَّ اللهَ مُخْزِي الْكَافِرِينَ (التوبة: ۲)

”اور یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔“

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ (توبہ، ۲۸)

”بے شک مشرکین ناپاک ہیں۔“

وَيُرِيدُ اللهُ أَن يُحِقَّ الحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ (الأنفال: ۷)

”مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔“

أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ (المائدة: ۵۴)

”جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے۔“

فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ (الممتحنة: ۱۰)

”پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ عورتیں مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو۔ نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لیے حلال۔“

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد: ۱۲)

”اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں، جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔“

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَاراً بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللهِ وَاللهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (الجمعة: ۵)

”جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا۔ ان کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ اس سے بھی زیادہ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا ہے۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔“

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (الأنفال: ۵۵)

”یقیناً اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والے جانوروں میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا، پھر کسی طرح وہ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔“

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَث ذَّلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا (الأعراف: ۱۷۶)

”لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔“

یہ اور اس طرح کی درجنوں آیات کا ہم کیا کریں گے؟ کیا ہم اسلام کی دعوت و تبلیغ کے نام پر انہیں غائب کر دیں یا ان میں بھی تحریف کا ارتکاب کریں؟ غالب مغربی تہذیب و ثقافت کے اسیر ہمارے مفکرین کے حلقے میں بہت سارے دینی موضوعات کے ساتھ کھلواڑ ہوتا ہے، مگر آخری چیز جس میں وہ تحریف کرنا چاہتے ہیں وہ یہی قرآن کا کافروں کے تئیں کڑا موقف ہے۔ قرآنِ کریم نے کفار کو عقلِ انسانی جس رذالت، اہانت، حقارت اور انحطاط کا تصور کر سکتی ہے، اس کے آخری درجے پر رکھا ہے اور کفر و شرک کی غلاظت اور اس میں ملوث انسانوں کی نجاست کے بارے میں قرآن نے جو تعبیریں اختیار کی ہیں وہ اپنے آپ میں کافی معنی خیز اور نقشہ کھینچ دینے والی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام قرآنی آیات کے

ساتھ کیا کھلواڑ کیا جائے گا؟

یہ ہمارے جدید مفکرین جو اسلامی عقیدے کو مغربی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں اور ولاء و براء کے شرعی تصور کو لبرل فلسفے کے تابع بنانا چاہتے ہیں، ان کی باتوں کا حتمی نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ کہ ایمان والے اپنے سب سے مضبوط ایمانی سہارے سے محروم ہو جائیں۔ اللہ کے رسولؐ کا ارشاد ہے کہ:

''ایمان کی رسی کی سب سے مضبوط گانٹھ یہ ہے کہ اللہ کی خاطر محبت رکھی جائے اور اسی کی خاطر بغض رکھا جائے۔''[إن أوثق عرى الإيمان أن تحب في الله وتبغض في الله] (مسند احمدؒ: ۴/۲۸۶/۱۸۵۲۴ عن براء بن عازب)

ہمارے ان لبرل مفکرین نے ولاء و براء کے مسئلے میں جس کارکردگی اور سرگرمی کا مظاہرہ کیا ہے یہ نہایت واضح نمونہ اور شاہکار اس بات کا ہے کہ یہ لوگ متشابہ کو محکم پر ترجیح دیتے ہیں۔ استثنائی صورتوں کو اصولی رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اصولوں کو استثناء بنانا چاہتے ہیں۔ اللہ نے اصولی طور پر کفار سے بغض رکھنے کا حکم دیا اور استثنائی طور پر نکاحِ کتابیہ کی اجازت دی، مگر ان مجتہدین نے یہ کیا کہ استثناء کو لے لیا اور اصل کو منہدم کر دیا۔ یہ کام خواہشاتِ نفس کے غلاموں کے علاوہ بھی کوئی کر سکتا ہے؟ اللہ کے واسطے اسلام کو اپنی فکری خدمات سے معاف رکھو، اس کے حصے بخرے کرنے اور اس کی صورت مسخ کرنے سے باز آجاؤ، صرف اس لیے کہ اپنے ہی جیسوں کی کسی مجلس میں تمہاری نادر تحقیقات سے کچھ ہونٹوں پر بناوٹی مسکان کھل جائے۔ دوسروں کو دھوکا دینے سے پہلے خود اپنی فریب خوردگی سے انسان کو بچنا چاہیے۔

والسلام على من اتبع الهدى وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمين

●●●

❁❁❁

(بقیہ صفحہ ۳۴ کا)

اس عوامی انقلاب کے نتیجے میں ختم ہوئی جسے آج روٹی کا انقلاب کہا جاتا ہے۔ تاہم، اس انقلاب کے بعد بھی تیونس، فرانس کے پروردہ گماشتوں کے پنجہ سے نہ نکل سکا کہ نیا حکمران بن علی تھا، مکمل طور پر بورقیبہ کی فوٹو کاپی۔

۲۰۱۱ء میں پھر تیونس کے دبے ہوئے، زیر دست، مفلوک الحال عوام میں سے ایک، ریڑھی بان، بوعزیزی کی خودسوزی نے ایک اور عوامی انقلاب کو جنم دیا۔ بوعزیزی کے راکھ میں دبے شراروں سے اٹھے اس انقلاب نے جلد ہی پوری عرب دنیا کو ربیع عربی (عرب بہار) کی لپیٹ میں لے لیا اور عشروں سے جمے عرب آمروں کے تخت الٹ گئے۔

تیونس کا پھر ایک اور دستور بنا۔ اس نئے دستور اور نئے انتظام کے تحت ملک بظاہر جمہوری دور میں داخل ہو چکا تھا، لیکن صدر قیس سعید کے حالیہ اقدامات سے ایسے لگتا ہے کہ تیونس پر ایک نیا بورقیبہ مسلط ہو چکا ہے۔ جو اگرچہ فصیح عربی بولتا ہے لیکن اپنے حقیقی خیالات کا اظہار اپنے آقاؤں کی زبان فرانسیسی میں کرتا ہے۔ ایمرجنسی لگانے اور دستور کو معطل کرنے کے اقدامات سے دراصل یہ زمانے کے پہیے کو پھر سے الٹا گھمانے کا خواہش مند ہے۔ چاہتا ہے ملک کو پھر سے واپس فرانسیسی دور میں لے جائے۔

اگرچہ تیونس میں یہ بحث ابھی جاری ہے کہ صدر کا اقدام بغاوت غلط تھی یا صحیح راستے کی طرف واپسی؟ تاہم، اطلاعات ہیں کہ امریکا کی نیشنل سکیورٹی کونسل کے سربراہ نے فون کر کے مطالبہ کیا ہے کہ نئی حکومت کی تشکیل اور معطل پارلیمنٹ کو بحال کیا جائے۔ باالفاظ دیگر صدر کے نام مغربی آقاؤں کا پیغام یہ ہے کہ تم نے ایمرجنسی لگا کر اچھا کیا ہے لیکن ہمیں تمھاری کامیابی کا یقین نہیں ہے۔

تیونس میں لگی حالیہ ایمرجنسی کے دوران قصر صدارت میں یہ واقعہ بھی پیش آیا ہے کہ یہاں کے دورے پر آئے ہوئے چند امریکی صحافی گرفتار ہوئے۔ پھر انھیں صدارتی مہمان بنا کر شرف ملاقات بخشا گیا۔ ملاقات میں صدر تیونس یقین دلاتے رہے کہ ''میں ڈکٹیٹر نہیں ہوں'' اور مہمانوں کو فرانسیسی زبان میں امریکی دستور کے اقتباسات سناتے رہے۔ آخر میں جب ان صحافیوں نے اپنے سوالات صدر کے سامنے رکھنا چاہے تو انھیں نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔

●●●

امریکہ، طالبان اور عورتوں کے حقوق

جاوید انور
ترجمانی: ابوحذیفہ جاوید

آج امریکہ اور دیگر مغربی ممالک افغانستان میں خود کو حقوق نسواں کے سب سے بڑے علمبردار کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ آج سے 2 دہائی قبل امریکہ نے اپنے 50 نیٹو حواریوں کے ساتھ افغانستان پر جب چڑھائی کی تھی تو اس وقت افغانستان پر طالبان برسرِ اقتدار تھے۔ امریکہ نے جو الزامات طالبانی حکومت پر چسپاں کر کے اپنی جنگ کو جواز فراہم کیا ان میں تعلیمِ نسواں، خواتین کے حقوق کا تحفظ وغیرہ سرفہرست تھے۔ کیونکہ بقول امریکہ، طالبان افغانی عورتوں کو امریکہ کی تمنّا کے مطابق جینے نہیں دے رہے تھے۔ یو ایس اے انٹرنیشنل کولیشن فورس نے طالبان کو اس جرم کی سزا افغانستان پر بھاری بمباری کر کے دی جس نے روس کی تباہی کے بعد ہوئی ترقّی کو زمین دوز کر دیا۔

فرانس کی پریس ایجنسی کی رپورٹس کے مطابق ان دو دہائیوں میں امریکہ نے اپنے 2448 اور اپنے حلیفوں کے 66000 فوجیوں کو قربان کر دیا جبکہ اس دوران 51000 افغان مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔ جبکہ 47245 افغانی شہریوں کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔

جب حقوق نسواں کے دعویدار امریکہ سے عورتوں اور بچّوں کی اموات کی رپورٹ پیش کرنے کو کہا گیا تو آج تک وہ اس سے قاصر رہا۔

سب سے پہلے اگر عورتوں کے حالات کا جائزہ خود امریکہ میں لگا لیا جائے تو ساری تصویر واضح ہو جاتی ہے۔ حالیہ رپورٹس کے مطابق ہر 6 میں سے 1 امریکی عورت جنسی استحصال کا شکار ہے۔ ہر 93 سیکنڈ میں ایک جنسی زیادتی کا معاملہ پیش آتا ہے جبکہ اب تک ٪41 خواتین اور بچیاں جنسی زیادتی کی شکار ہو چکیں ہیں۔ ان میں سے 80 فیصد سے زائد کی عمریں 25 سال سے کم بتائیں گئی ہیں۔ 20000 سے زائد جنسی استحصال کا معاملہ صرف امریکی فوج میں درج کیا گیا ہے۔ امریکہ میں عائلی نظام اس حد تک گراوٹ کا شکار ہے کہ 95 فیصد سے زیادہ خواتین اپنے اقرباء کے ذریعے ہی جنسی زیادتی کا شکار ہو چکی ہیں۔ روز تقریباً 70 سے زائد خواتین جنسی تشدّد سے پریشان ہو کر خودکشی کر لیتی ہیں۔ اس رپورٹ کا سب سے تاریک پہلو یہ ہے کی جنسی تشدّد کرنے والے 1000 میں سے 995 افراد کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ طالبان سے شاید امریکہ اسی لیے خائف ہے کیونکہ وہ مجرموں کو موقع پر اسلامی شرعی قوانین کے مطابق سزا دیتے ہیں جبکہ امریکی عدلیہ اُنھیں تحفظ فراہم کرتی ہے۔ امریکی خواتین صحافی کے مطابق خود اُسے مصر کے مقابلے نیویارک کی شاہراہوں پر چلنے میں ڈر محسوس ہوتا ہے۔ جبکہ امریکہ دنیا کی خواتین کو اب تک یہی یقین دلاتا رہا ہے کہ انکے لیے مسلم ممالک میں حفاظت کا سامان نہیں ہے جب کہ اس کے بالمقابل نیویارک اور واشنگٹن کی گزرگاہیں اُنھیں اصل تحفظ فراہم کرتی ہیں۔

امریکہ میں ہر 20 منٹ میں ایک گھریلو تشدد کا معاملہ درج کیا جاتا ہے جس میں سے اکثر معاملات میں تشدّد کے طور پر جان لیوا ہتھیاروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ خیر یہ تو امریکہ کا اندرونی معاملہ ہے اگر بیرونِ ملک اسکے کرتوت نظر سے گزرے تو یقیناً یہ واضح ہو جائیگا کہ امریکہ کے نزدیک حقوق نسواں نام کی کوئی چیز نہیں۔ دوسری عالمی جنگ میں فتح کے جشن کے طور پر امریکا، روس اور برطانیہ کی مسلح افواج نے تقریباً ڈھائی ملین (پچیس لاکھ) عورتوں کو جنسی زیادتی کا شکار بنایا تھا۔

اسلام سے پہلے عورتوں کے حقوق کی پامالی

ہندوستان، چین اور مصر وغیرہ میں عام بات تھی۔ وہاں اُنھیں مردوں کا غلام بنا کر رکھا جاتا تھا اور میراث میں انکا کوئی حصہ نہ ہوتا تھا۔ دنیا نے پہلی بار ۱۸۳۹ء میں مسیسپی میں عورتوں کو زمین خریدنے کا حق دیا لیکن وہ بھی مرد کے اجازت کے بعد۔ ۱۸۶۶ء کے آواخر تک امریکہ نے عورتوں کو ووٹ اور دیگر بنیادی حقوق سے بھی روکے رکھا۔ امریکہ ہر مسلم ملک میں خواتین وزیر اعلیٰ کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہے جبکہ آج تک امریکہ میں کوئی بھی عورت صدر نہ بن سکی۔

مظلوم عافیہ صدیقی کو اسی حقوق نسواں کے علمبردار نے 86 سال قید کی سزا سنائی ہے جبکہ یہ بات ثابت بھی ہو چکی ہے کہ عافیہ صدیقی نے کسی کا قتل نہیں کیا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ایسی ظالم حکومت آج طالبانی حکومت کو افغانستان میں حقوق نسواں کی پاسداری کا درس دے رہی۔ یقیناً یہ بات سب کے علم میں ہوگی کہ روس کے افغانستان سے انخلاء کے بعد امریکہ نے انارکی پھیلانے کی پوری کوشش کی جس کو رفو کرنے کے لیے مذہبی علماء اور اسلام پسند خود دار جوانوں نے آگے بڑھ کر زمامِ کار ہاتھ میں لی اور افغانستان کو امن کی سرزمین بنایا۔ اور امن بھی اس پائے کا کہ پورے پانچ سالہ دور حکومت میں جنسی استحصال کا ایک بھی واقعہ افغانستان میں پیش نہیں آیا۔ عورتوں کو وہ سارے حقوق فراہم کیے گئے جو اُنھیں اسلام نے دیئے ہیں اور انہیں اپنی آزاد پہچان بنانے کا پورا موقع فراہم کیا گیا تھا۔ عورتیں جائیداد خریدنے میں، کاروبار کرنے میں، وراثت کی حصے داری میں اور دیگر تمام شرعی معاملات میں مکمل آزاد تھیں۔ نئی طالبانی حکومت نے عورتوں کو ہسپتال اور اسکول میں نوکری کی اجازت بھی دی اور ساتھ ہی بچیوں کو اُنکے اسکول میں باضابطہ تعلیم کے لیے بھی ابھارا۔ دراصل اسلام نے عورتوں کو مردوں کے بالمقابل زیادہ حقوق دیئے ہیں جبکہ ذمے داری کم سونپی ہے۔ اسلام نے جنت کو ماں کے قدموں میں ڈال کر روحانی طور پر بھی عورتوں کا رتبہ بڑھا دیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے ایک صحابی کو اُنکے اچھے اخلاق کا پہلا حقدار اُنکی ماں کو بتایا، تین مرتبہ اپنے ماں کا نام لیا پھر باپ کا تذکرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو گھر کے باہر کی مصروفیت اور مشکلات سے رہائی دی اور گھر کے اندرونی معاملات جیسے بچّوں کی تعلیم و تربیت، گھر کو جنت بنانے وغیرہ کاموں میں کلیدی کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کیا۔

جس طرح سونے چاندی جیسی قیمتی چیزوں کو چھپا کر رکھنے کی اہمیت ہے، کیونکہ معاشرے میں اسکی قدر ہے، ٹھیک اسی طرح عورت چونکہ ایک قیمتی مخلوق ہے اس لئے اسے نقاب اور پردے سے آراستہ کرنے پر توجہ دلائی گئی۔ چونکہ مرد اور عورت کے الگ الگ حقوق اور ان کی ذمے داریاں ہیں اس لیے ضروری ہے کی دونوں کی تعلیم کا نظم بھی الگ ہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ طالبان افغانستان میں کر رہے وہ عین اسلامی اصولوں پر کر رہے، آخر وہ کیوں دنیا اور مغربی ممالک کو خوش کر کے اپنا نقصان کریں۔ ہماری مسلم بھائیوں اور بہنوں سے گزارش ہے کہ دشمن کی سازشوں کا شکار نہ ہوں اور مغرب کی ہر چیز کو یونہی بے چوں چراں لینے کی صفت کو بدلیں۔ غیر مسلم بھائیوں سے درخواست ہے کہ وہ ایسے موقع پر انصاف کے ساتھ اسلام کے عائلی نظام کا مطالعہ کریں تاکہ راہِ حق کو با آسانی دیکھ سکیں۔ آمین!

●●●

فارم نمبر چار (Form (4

مالک : شیخ نثار شیخ چاند

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پہلا منزلہ بسیرا اپارٹمنٹ کے سامنے سبھاش چوک آکولہ۔

پرنٹر : شیخ نثار شیخ چاند

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پہلا منزلہ بسیرا اپارٹمنٹ کے سامنے سبھاش چوک آکولہ۔

ایڈیٹر : شیخ نثار شیخ چاند

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پہلا منزلہ بسیرا اپارٹمنٹ کے سامنے سبھاش چوک آکولہ۔

وقفہ اشاعت : ماہانہ

مقام اشاعت: پہلا منزلہ بسیرا اپارٹمنٹ کے سامنے سبھاش چوک آکولہ۔

میں پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر شیخ نثار شیخ چاند اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم کے مطابق بالکل صحیح ہیں۔

دستخط : شیخ نثار شیخ چاند

☼☼☼

آزادی کے وہم میں گھرا تیونس

حافظ محمد عبداللہ

گذشتہ پانچ صدیوں میں اور سقوط غرناطہ کے تھوڑے ہی عرصے بعد دنیا نے بہت بڑی بڑی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ اسی عرصے میں یورپ اپنے عافیت کدے سے نکلا اور عالمی وسائل پر قبضہ جمانے اور انھیں اپنے ہاں منتقل کرنے کے لیے اپنے وقت کی مہذب دنیا پر درندے کی مانند ٹوٹ پڑا۔ مسلم مشرق پر براہِ راست یہ حملہ دو عنوان سے تھا: صلیبی فوجی حملوں کا تسلسل اور عالمی تجارت پر غلبہ۔ نئی جغرافیائی دریافتوں نے یورپ کو مہمیز دی اور استعماری قبضہ بڑھانے کے لیے انھی کو یورپ نے وجہِ جواز بھی بنایا۔ 'نئی دنیا' یعنی شمالی امریکا کی دریافت بھی دراصل مشرق (خصوصاً مسلم ہندوستان) تک رسائی ہی کی ایک کوشش تھی۔ یورپی اقوام میں سخت مقابلہ تھا کہ نئے دریافت شدہ خطوں کے وسائل پر تسلط جما کر انھیں اپنے ہم عصروں اور پرانی دنیا پر اپنی دھاک، دھونس جمانے کے لیے استعمال میں لایا جائے۔

اس دوران مسلم دُنیا کے اوّلین دفاعی مورچے اور مشرق کی طرف یورپی اقوام کے پہلے پڑاؤ، شمالی افریقہ (تیونس، الجزائر، مراکش اور لیبیا) پر کیا گزری؟ خطے کی تاریخ کا یہ عرصہ جن اہم حوادث اور واقعات سے پُر ہے، اسے سمجھے بغیر خطے کے موجودہ حالات کو سمجھنا مشکل ہے۔

سقوط غرناطہ اور اندلس سے مسلمانوں کو کھرچ کر نکالنے کا سلسلہ کم وبیش ایک سو برس تک جاری رہا۔ اس دوران اسپین اور پرتگال کی فوجیں مسلسل شمالی افریقہ کے ساحلوں کو تاراج کرتی رہیں۔ مراکش کے شہر سبتہ سے ملیلہ تک، الجزائر اور تیونس کے ساحلوں سے لے کر طرابلس الغرب، یعنی لیبیا کے ساحل تک، یہ سارا علاقہ ان ابھرتی ہوئی یورپی استعماری طاقتوں اور مقامی مسلمان حکمرانوں کے درمیان میدان جنگ بنا رہا۔ جلد ہی خطے کے مسلم حکمرانوں کو اندازہ ہوگیا کہ اس بڑھتے صلیبی حملے کو روکنا ان کے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے بچاؤ کے لیے خلافت عثمانیہ سے مدد کی اپیل کی۔ خلافت کی مداخلت اور عملی فوجی مدد ہی کے نتیجے میں تیونس اور الجزائر اس ہلاکت خیز یورپی استعماری یلغار سے بچنے میں کامیاب رہے۔ چنانچہ مراکش نے بھی عثمانیوں سے دفاعی معاہدہ کیا اور یوں شمالی افریقہ، یورپی سیلاب کے آگے بند باندھنے میں کسی حد تک کامیاب ہوگیا۔ مراکش کے صرف دو شہر سبتہ اور ملیلہ یورپیوں کے قبضے میں رہ گئے تھے۔

اسپین اور پرتگال کے کمزور پڑ جانے پر شمالی افریقہ کی صورت حال میں کچھ بہتری آئی اور انتظام حکومت مقامی لوگوں کے ذریعے چلایا جانے لگا۔ اس نئے انتظام کی سربراہی، سرپرست کے طور پر عملی یا رسمی خلافت عثمانیہ کرتی تھی۔

انقلاب فرانس کے بعد اور نپولین بوناپارٹ کے یورپ اور پوری دُنیا پر تسلط جمانے کے عزم نے مصر اور شمالی افریقہ کو ایک بار پھر فرانس کی سامراجی ریشہ دوانیوں کا شکار کر دیا۔ ۱۹ویں صدی کے صنعتی انقلاب نے جارح یورپ کی طاقت میں بے تحاشا اضافہ کر دیا تھا۔ اب پورے شمالی افریقہ پر قبضہ کا پرانا فرانسیسی خواب پھر انگڑائی لینے لگا۔ یوں ۱۸۸۱ء تک تیونس اور الجزائر، فرانسیسی قبضے تلے سسک رہے تھے۔

یورپی سامراج نے دونوں ملکوں پر تسلط جمانے کے لیے دو مختلف انداز اختیار کیے تھے۔ تیونس اور پھر مصر کو بھی بیرونی قرضوں کے جال میں جکڑا گیا۔ سرکاری سطح پر بے تحاشا اسراف،

اشرافیہ کی شاہانہ زندگی اور ظاہری نمود ونمائش پر بے اندازہ خرچ کرنے کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی جاتی رہی، بلکہ ہر سطح پر اس کے فروغ میں فعال کردار ادا کیا گیا۔ دونوں ملک جب مالیاتی دیوالیہ پن کا شکار ہوئے تو قرض خواہوں کے حقوق کے نام پر دونوں ملکوں کو مالیاتی حفاظتی تحویل میں لے لیا گیا، جو آگے چل کر سیاسی غلبے اور پھر فرانس کے مکمل قبضے پر منتج ہوا۔ اس عرصے میں خلافت عثمانیہ پر جب بھی کڑا وقت آیا، ان قابض سامراجی طاقتوں نے اسے خطے میں اپنے اثر ونفوذ کو بڑھانے کے لیے سنہری موقعے کے طور پر لیا اور اپنا استبدادی پنجہ محکوموں کی گردن پر گاڑتے چلے گئے۔

تاہم، الجزائر کی مقامی حکومت نے شاہِ فرانس نپولین کے دور میں ہونے والے فرانس کے محاصرے سے فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو اقتصادی طور پر کچھ مضبوط کرلیا۔ مگر فرانس نے جنگ چھیڑنے کے لیے یہاں پر بھی بہانہ انھی پرانے قرضوں کو بنایا، جو الجزائر کے ذمے واجب الادا تھے۔ جنگ بلقان کے دوران ایک ہی ہلے میں ایک طرف سربیا، یونان اور دوسری طرف الجزائر پر ہاتھ صاف کرلیے۔ یوں شمالی افریقہ کے یہ مسلم ملک طویل دور ظلمات میں دھکیل دیئے گئے۔ ایک ایسا تاریک عہد کہ جس میں استعماری قبضہ تھا، فرنچ تہذیب کا غلبہ تھا، تیونس اور الجزائر کی اسلامی شناخت مٹانے اور جغرافیائی خدوخال بگاڑنے کے منصوبے تھے۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو شمالی افریقہ کی ان محکوم اقوام کو جنگ کی تپتی بھٹی میں جھونک دیا گیا۔ اس بھٹی میں الجزائر اور سینی گال جیسے بڑے ملکوں کے باشندے ایک بڑی تعداد میں جل مرے۔ مارے جانے والے کتنی بڑی تعداد میں تھے؟ اس کا اندازہ تیونس جیسے چھوٹے ملک کے ہلاک شدگان کی تعداد سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں تیونس کے ۸۰ ہزار مسلمان، فرانسیسی پرچم کی سربلندی کے لیے اپنی جان کی بازی ہار گئے۔

جنگ کے خاتمے پر اور خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد 'انجمن اقوام' (League of Nations) کی چھتری تلے نوآبادیاتی یورپی طاقتوں نے 'انتداب' (mandate) کا ڈول ڈالا۔ انتداب کے اس نام نہاد نظام کے تحت قابض طاقت ہی کو یہ قانونی حق دے دیا گیا کہ وہ مغلوب قوم پر اپنا سامراجی شکنجہ مضبوط کرے اور اس کی اجتماعی زندگی، سیاسی اداروں اور جغرافیے کی تشکیل نو کرے۔ اقبالؒ بالادست یورپی طاقتوں کی ان چیرہ دستیوں کی بہترین تصویر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلادیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری

'نظام انتداب' کے بعد داخلی خودمختاری کا ڈول ڈالا گیا۔ مقصد تھا مقامی چہروں مہروں کے ساتھ استبدادی نظام قائم رکھنا۔ تیونس میں سیاسی ادارے اور سیاسی جماعتیں بھی تھیں، لیکن سب کا اختیار و اقتدار انتہائی محدود۔ ملک اقتصادی اور ثقافتی طور پر پوری طرح فرانس کا محکوم اور باج گزار بنا دیا گیا تھا۔ جس نے رفتہ رفتہ تیونس کی اپنی شناخت، عقیدے، اصول، اس کی تہذیب و ثقافت، زبان و تمدن سب کچھ کو مکمل بدل کر رکھ دیا۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا درمیانی عرصہ نیشنل ازم کے علَم برداروں کے لیے انتہائی مایوس کن تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں فرانس دنیا کی سپر پاور بن کر ابھرا تھا۔ اس کے پاس دنیا کی سب سے بڑی بَری فوج تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ظالموں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ رکھی۔ اس کی سنت اس میں ہر دم جاری وساری رہتی ہے:

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (البقرہ: ۲۵۱)

''اگر اس طرح اللہ، انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا، تو زمین کا نظام بگڑ جاتا''۔

دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوتے ہی نازی جرمنی کے ہٹلر نے فرانس پر قبضہ کرلیا۔ یہ فرانسیسی غرور اور نخوت کے لیے ذلت کا مقام تھا اور اسی سے فرانس کا اپنے طبیعی جغرافیائی حدود کی طرف واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔ پھر فرانس کو ۱۹۵۴ء کی ویت نام جنگ میں بھی بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ تھے وہ حالات جن میں الجزائر اور تیونس میں آزادی کی تحریک نے زور پکڑا۔ یوں خطے

میں سیاسی، انقلابی اور فوجی جدوجہد کا آغاز ہوگیا۔ فرانس نے اپنے نقصان کو کم سے کم رکھنے کے لیے سیاسی تدبیروں کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے محکوم قوموں کو داخلی خودمختاری کی نوید سنائی گئی۔ لیکن کس نخوت کے ساتھ؟ اس کے لیے فرانسیسی وزیراعظم کا وہ خطاب پڑھنے کے لائق ہے، جو تیونس کے محمدالامین کے سامنے کیا گیا تھا:

''تیونسی قوم جس حد تک ترقی کر چکی ہے، ہمیں اس پر خوشی منانے کا پورا حق ہے، خصوصاً اس لیے کہ ہم نے ہی تیونس کو ترقی دینے میں اصل کردار ادا کیا ہے۔ یہاں کی اشرافیہ کی بالغ نظری قابل تحسین ہے اور جواز فراہم کرتی ہے کہ تیونسی قوم اپنے امور خود سنبھالے۔ اس لیے ہم تیار ہیں کہ داخلی امور تیونسی افراد اور اداروں کے سپرد کر دیں''۔

حبیب بورقیبہ نے بطور سربراہ دستوری فریڈم پارٹی مجوزہ داخلی خودمختاری کے لیے فرانس تیونس مذاکرات کی فوری تائید کر دی۔ مجاہدین آزادی اور مزاحمت کاروں کو پہاڑوں سے اتر آنے اور ہتھیار سپرد کر دینے کا مشورہ دیا۔ تاہم، سویز رلینڈ میں مقیم پارٹی کے سیکرٹری جنرل صالح بن یوسف نے کھل کر حبیب بورقیبہ سے اختلاف کیا اور اس پر وطن سے غداری کا الزام عائد کیا۔ مسلح مجاہدین کو نہ صرف تیونس بلکہ پورے شمالی افریقہ کی مکمل آزادی تک مزاحمت جاری رکھنے کی ہدایت کی گئی۔

تاہم، جنگ عظیم میں زخم خوردہ فرانسیسی حکومت نے منصوبے کے مطابق مئی ۱۹۵۵ء میں داخلی خودمختاری کے قانون پر دستخط کر دیئے۔ جلاوطن بورقیبہ واپس وطن لوٹ آئے اور انھیں آزادی کا ہیرو بنا کر پیش کیا گیا اور پھر مراکش کے بعد ۲۰ مارچ ۱۹۵۶ء کو تیونس کو بھی مکمل آزادی دے دی گئی۔

۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء کو پارلیمان کی تائید سے بورقیبہ نے بادشاہت ختم کر دی اور خود تیونس کے صدر بن گئے۔ بورقیبہ نے اپنے اقتدار کے ابتدائی مہینوں سے ہی، تیونسی معاشرے کو فرانسیسی مقتدرہ کے حسب منشا ڈھالنے پر کام شروع کر دیا تھا۔ اگست ۱۹۵۶ء کو سرکاری گزٹ میں 'نیا پرسنل لا' شائع ہوا، جس کے تحت دوسری اور تیسری شادی پر قانوناً پابندی عائد کر دی گئی اور سول کورٹس کو طلاق کے معاملات پر نظرثانی کا اختیار دے دیا گیا۔ اوقاف تحلیل کر دیئے گئے اور شرعی عدالتوں کو ختم کرتے ہوئے فرنچ جوڈیشل سسٹم نافذ کر دیا گیا۔

۱۹۵۸ء میں جامعہ زیتونہ کے نظام تعلیم اور اس تاریخی اسلامی یونی ورسٹی کے زیر انتظام اداروں کو تعلیم کے عمومی سیکولر نظام تعلیم میں ضم کر دیا گیا۔ اسی مہینے میں تیونس کی نیشنل آرمی تشکیل دی گئی اور اپریل ۱۹۵۶ء میں سیکورٹی سسٹم کو مکمل طور پر سیکولر تیونسی رنگ میں رنگ دیا گیا۔

جون ۱۹۵۹ء میں جمہوریہ تیونس کا پہلا آئین نافذ ہوا اور اسی سال نومبر میں ایک مضحکہ خیز الیکشن میں بورقیبہ ۹۹ فی صد ووٹ لے کر پانچ برس کے لیے جمہوریہ کے پہلے صدر بن گئے اور ان کی فریڈم پارٹی نے پارلیمنٹ کی ۱۰۰ فی صد نشستیں حاصل کر لیں۔

سیاسی محاذ پر صالح بن یوسف کے حامیوں کا گھیرا تنگ کیا جاتا رہا۔ ان کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کی گئیں اور ان عدالتوں نے مخالفین کو پھانسیوں کی سزائیں سنانا شروع کر دیں۔ حتیٰ کہ ۱۹۶۱ء میں صالح بن یوسف قتل کر دیے گئے۔

۱۹۶۲ء میں روزہ رکھنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ سرکاری طور پر تجویز یہ کیا گیا کہ سرکاری ملازم اپنے روزوں کی قضا ریٹائرمنٹ پر ایک ساتھ یا دیگر مناسب اوقات میں اپنی مرضی سے پوری کر لے۔ بورقیبہ نے کوشش کی کہ تیونسی شہریوں کو مقدس مقامات کی زیارت خصوصاً حج بیت اللہ سے روکا جائے۔ دلیل یہ دی گئی کہ ''حج پر جانے سے ملک کا قیمتی زرمبادلہ صرف ہوتا ہے''۔ سرکاری سطح پر متبادل یہ تجویز کیا گیا کہ ''حج کے بجائے اولیاء اللہ اور صالحین کے مقامی مزاروں سے خیر و برکت حاصل کر لی جائے۔ ابوزمعۃ البلوی یا ابولبابۃ الانصاری کے مزار اقدس پر حاضری دے لی جائے''۔ یہ تجویز کسی ادنیٰ سرکاری ملازم کی نہیں تھی بلکہ جمہوریہ تیونس کے صدر حبیب بورقیبہ نے خود صفاقس شہر میں ۲۹ اپریل ۱۹۶۴ء کو اپنے خطاب میں دی تھی۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فرانسیسی فوجیں ۱۹۶۳ء تک تیونس میں تھیں تو ہمیں پے در پے لوگوں کے عقیدے اور ایمان کے خلاف کیے گئے ان فیصلوں کی اصل وجہ سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ فرانس کا منصوبہ تھا کہ کہ تیونس پر اس کا غلبہ کمزور نہ ہو، بلکہ مقامی باشندوں کے بھیس میں اس کا اثر و نفوذ برقرار رہے۔ یوں بظاہر تیونس آزاد تو ہوا لیکن بورقیبہ کی وحشت انگیز ڈکٹیٹرشپ

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر)

خواتین اور غیرت مسلم

مریم جمیلہ فلاحی

خواتین کے سلسلے میں دین اسلام کو ہمیشہ ہدف تنقید بنایا گیا اور آج بھی بنایا جارہا ہے۔ کبھی ظلم وستم کے نام پر، تو کبھی مراعات وحقوق نہ دینے کی صورت میں، تو کبھی حمیت وغیرت کے نام پر ہر طرح سے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوشش جاری ہے۔ مگر جب ہم اسلامی تعلیمات اور تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو حقیقت کچھ اور نظر آتی ہے۔ اسلام نے جہاں عورتوں کے تحفظات کی بات کی ہے وہیں ان پر ہورہے ظلم کو روکنے کے لیے مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو بھی للکارا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَمَا لَكُمْ لاَ تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا مِنْ هَـذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيّاً وَاجْعَلْ لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيراً“

”آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا دیئے گئے ہیں اور فریاد کررہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی ومددگار پیدا کردے۔“

جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں حجاج بن یوسف، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد اور معتصم باللہ جیسے گورنر، سپہ سالار اور خلیفہ کے واقعات ملتے ہیں جن کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ بہن و بیٹی پر ظلم وستم کا پہاڑ توڑا جائے اور وہ خاموش رہیں۔

مگر آج چہار جانب ظلم و بربریت کا بازار گرم ہے عورتوں کی عصمتوں کو لوٹا جارہا ہے اور ان پر بے پناہ مظالم ڈھائے جارہے ہیں۔ گوانتاناموبے اور ابوغریب جیسی بے شمار سلاخوں کے پیچھے سے ان بے گناہوں کی چیخیں ہماری روح کو جھنجھوڑ رہی ہیں اور فریاد کررہی ہیں کہ ہے کوئی حجاج بن یوسف، کوئی محمد بن قاسم، طارق بن زیاد اور معتصم باللہ بن کر اپنی اس بہن بیٹی کی عصمت و ناموس کو بچانے کے لیے اٹھ کھڑا ہو لیکن افسوس! آج کے مسلم حکمراں اقتدار اور ذاتی مفاد کے چکر میں قومیت اور جمہوریت کے فرسودہ نعروں کے پیچھے ایسا گم ہیں کہ ان کو اپنی حکومت میں عورتوں پر ہورہے ظلم خود انھیں بھی نہیں سنائی دیتے۔

ایک مرتبہ سعد بن عبادہؓ نے کہا اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر مرد کو دیکھوں تو اسے اپنی سیدھی تلوار سے قتل کر ڈالوں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا تمہیں سعد کی غیرت پر حیرت ہے یقیناً میں اس سے بھی زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ مجھ سے بھی زیادہ غیرت مند ہے۔

ایک مرتبہ بنو قینقاع کے یہودیوں نے ایک مسلم عورت کو سر بازار برہنہ کردیا تو وہ چیخ اٹھی اور اس نے فرمایا کہ ظالموں نے میرے ساتھ بدسلوکی کی ہے تو اسی وقت امت کا ایک غیرت مند جوان اٹھا اور اس شر پسند ظالم کو جہنم واصل کیا اور بدلے میں اپنی جان کو اسلام پر قربان کردیا۔ اللہ کے رسولؐ کو جب اس کی خبر پہنچی تو آپؐ نے فوراً بنوقینقاع کو مدینہ سے دربدر کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ تھا اسلام میں غیرت وحمیت کا حال آپ کی آمد نے خواتین کی عزت وناموس کو بچایا اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کا خاتمہ کیا یہ عظیم کارنامہ صرف محسن انسانیت کی تعلیمات کی روشنی میں پہلی بار رونما ہوا۔ اس

کے بعد اس مشن کو آپ کے متبعین نے جاری رکھا۔

جب ہم تاریخ کے اوراق کو پلٹتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں ملّی غیرت نظر آتی ہے۔

آئیے ہم جائزہ لیتے ہیں کہ ان خواتین کے تعلق سے اسلامی غیرت وحمیت کے سلسلے میں مسلم حکمرانوں کا کیا طرز عمل رہا ہے۔

حجاج بن یوسف اگرچہ بڑا ہی سفاک، ظالم بادشاہ تھا لیکن اس کے باوجود اس میں اعلیٰ صفات بھی تھیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے اندر اسلامی غیرت وحمیت زندہ تھی۔ واقعہ کچھ یوں ہی کہ ولید کے دور حکومت میں کچھ مسلمان تاجر سری لنکا میں آباد ہو گئے تھے ان میں سے جب ایک کا انتقال ہوا تو وہاں کے راجہ نے اس کے پس ماندگان کو جہاز پر سوار کر کے عرب بھیج دیا جب یہ جہاز دیبل کی بندرگاہ کے قریب پہنچا تو سندھ کے بحری لٹیروں نے حملہ کر کے مال و اسباب لوٹ لیا۔ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا۔ اس گرفتاری کے وقت ایک عورت کے منھ سے بے اختیار نکل پڑا ''واحجاجاہ'' اے حجاج میری مدد کر۔ قید خانے سے مسلم دوشیزہ کا فریاد نامہ جب حجاج کو موصول ہوا تو وہ بے چین ہوا اٹھا اور سندھ کے راجہ داہر کو لکھا کہ ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے ان کو سزا دی جائے اور مسلمان عورتوں اور بچوں کو واپس کر دیا جائے۔ راجہ نے حجاج کے حکم کو نظر انداز کر دیا۔ تب حجاج نے محمد بن قاسم کو سندھ پر حملہ کرنے کا حکم دیا راجہ داہر مارا گیا اور محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کر کے اسیروں کو رہا کرایا۔ یہ تھا حجاج اور محمد بن قاسم کا ظلم کے خلاف لڑنے کا جذبہ اور یہ تھا اسلامی تاریخ کے ایک سفاک بادشاہ کا ضمیر اور ملت اسلامیہ کی ایک بیٹی کی عصمت وعفت کو بچانے کے لیے اس کی ملّی غیرت کا مظاہرہ۔

عباسی دور حکومت میں ایک مسلم حکمراں معتصم باللہ نے عورتوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کی اس نے سرزمین روم پر کئی بار چڑھائی کی اور ہر دفعہ متعدد علاقے اور قلعہ فتح کئے۔ جب قیصر روم نے سرحدی شہر زبطرہ کو برباد کر دیا اور وہاں کے مسلمان باشندوں کو قتل کر ڈالا پھر ملیطہ کو فتح کر کے وہاں کے باشندوں پر شرمناک مظالم ڈھائے، بہت سی مسلمان عورتوں کو گرفتار کر لیا، جو بھی مرد ہاتھ آیا اس کی آنکھوں میں گرم سلاخیں پھیر کر اندھا کر دیا اور ناک، کان کاٹ ڈالے۔ چنانچہ انھیں میں ایک بوڑھی عورت کو رومی بیڑیوں میں جکڑے لئے جارہے تھے وہ پکار اٹھی ''وامعتصماہ'' ''اے معتصم ہماری مدد کر'' جب معتصم کو اس کی خبر ہوئی تو وہ غصّے سے بے تاب ہوگیا۔ وہ لبیک کہتے ہوئے تخت سے کود پڑا اور اسی وقت اپنی فوجوں کو روانگی کا حکم دیا۔ بوڑھی عورت اور دیگر قیدیوں کو رہا کرایا۔

اسی طرح اسپین کے ظالم بادشاہ راڈرک نے جب جولین کی بیٹی کے ساتھ دست درازی کی تو جولین نے موسیٰ بن نصیر سے اسپین پر مسلم افواج کے حملے کی سفارش کی تاکہ عوام الناس کو اس ظالم بادشاہ کی چیرہ دستیوں سے نجات مل سکے۔ چنانچہ طارق بن زیادہ کے ہاتھوں اسپین فتح ہو کر اسلامی مملکت کا حصہ بنا۔

ان کے علاوہ تاریخ میں بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے امت مسلمہ کی عورتوں کے سلسلے میں غیرت وحمیت کا پتہ چلتا ہے۔

●●●

نظم

خارزاروں سے آگے بڑا گلستاں
راہ تکتا ہے اہلِ وفا آئیں گے
روز کہتے ہیں گل آفریں ہم سبھی
ان کے قدموں میں بن کے صفا آئیں گے

رزم گاہوں میں کیسا بپا شور ہے
کیا ابابیل لشکر بنانے لگے
گولیوں کے مقابل یہ اہلِ حرم
پتھروں سے شجاعت دکھا آئیں گے

کوہساروں میں اہلِ وفا کا لہو
بہتے بہتے بشارت سناتا رہا
سرزمین خدا دشمنوں سے سبھی
اہلِ ایمان اک دن چھڑا آئیں گے

رہ نہ جانا پرے قافلوں سے کہ یہ
سوئے منزل خراماں خراماں چلے
اپنے ہاتھوں میں شمعِ فروزاں لیے
ظلمتوں کے اندھیرے مٹا آئیں گے

ایک چھوٹا سا بچہ فلسطین کا
درس دیتا ہے ایماں کی تجدید کا
مسکراتے ہوئے کھلکھلاتے ہوئے
رسم راہِ وفا ہم نبھا آئیں گے

(مومن بندیؔ)

اسلامی سیاست

مبصر: ابوالفیض اعظمیؔ

مولانا گوہر رحمان برصغیر کے ممتاز عالم دین اور سرگرم تحریکی رکن رہے ہیں ساتھ ہی آپ دارالعلوم تفہیم القرآن (مردان) کے شیخ الحدیث بھی تھے۔ مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی فکری رہنمائی کی کوشش کی ہے۔

زیرنظر کتاب (اسلامی سیاست) جس موضوع کے تحت لکھی گئی ہے اس تعلق سے امت مسلمہ کی اکثریت ہمیشہ تذبذب کا شکار رہی ہے۔ یہ ذہنی انتشار ان کی ناخواندگی کی وجہ ہو یا نہ ہو لیکن اسے بڑھاوا دینے میں سرکاری دانشور اور زرپرست علماء کرام کا ایک بڑا طبقہ ضرور کوشاں ہے۔ یہ اس لیے کیا جارہا ہے کہ امت مسلمہ کی اکثریت اسلامی سیاست وخلافت سے ناواقف رہے اور دنیا کے بنائے ہوئے باطل نظاموں میں اپنا اور اپنی قوم کے لیے تابناک مستقبل تلاش کرتا رہے، اس کے لیے وہ اپنا وقت، دولت، صلاحیت سب کچھ گنوا دیتا ہے۔ آخر میں اسے ناکامی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ دنیا میں پائے جانے والے جتنے بھی نظام ہائے زندگی ہیں جو بار بار اس کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری حکومت، ہمارا ملک اور ہمارا نظریہ سب سے اعلیٰ ہے وہ انسان کو تحفظ کے ساتھ مکمل آزادی دیتا ہے، ان کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی ہے۔ اسلامی خلافت وسیاست کے رہتے ہوئے جو آزادی ان کو ملی ہے تاریخ کے اوراق اس سے بھرے پڑے ہیں۔ دنیا آج تک اسکی کوئی نظیر نہ پیش کرسکی۔ آج بھی انسانوں کے تحفظ وبقا کے لیے خلافت ہی بہتر ہے۔

مولانا گوہر رحمٰن کی تالیف کردہ کتاب ''اسلامی سیاست'' تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں سیاست کی لغوی تحقیق، اصطلاحی تعریف اور اس کی قسموں کے علاوہ سیاست کے بارے میں ماہرین کی آراء کو قلم بند کیا گیا ہے۔ مصنف نے ''سیاست کی تعریف مسلم ائمہ کی نظر میں'' مختلف ائمہ کی باتوں کو نقل کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ابن خلدون نے سیاست کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

''سیاست اور حکومت مخلوق کی نگہداشت اور ان کے مفادات کی کفالت وضمانت کا نام ہے۔ یہ سیاست خدا کی نیابت ہے اس کے بندوں پر اسی کے احکام نافذ کرنے کے کام ہیں۔'' (ص:۱۸)

''سیاست کی تعریف دور جدید کے ماہرین کے نظر میں'' اس کا احاطہ کرتے ہوئے صاحب کتاب لکھتے ہیں:

''جدید علماء سیاست کی نظر میں یہ تعریفیں وہی ہیں جو علماء اسلام اپنی کتابوں میں صدیوں پہلے بیان کرچکے ہیں۔ لوگ یورپ کے بڑے بڑے ناموں سے مرعوب ہوجاتے ہیں۔'' (ص:۲۶)

مصنف نے دوسرے باب میں غیر اسلامی سیاسی نظریات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ غیر اسلامی نظریات کی سوچ کہاں تک جاسکتی ہے۔ ملوکیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت سے زیادہ جابرانہ نظام کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جو اللہ کے بندوں کو فرد واحد کی اغراض وخواہشاتِ نفس کا غلام بناتا ہے۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''سب سے زیادہ گندہ اور برا نام اس شخص کا ہے جو اپنے آپ کو شہنشاہ کہلاتا ہو۔'' (ص:۶۹۔۷۰)

پاپائیت یعنی تھیا کریسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تھیا کریسی یعنی پاپائیت بھی ملوکیت اور آمریت ہی کی دوسری شکل ہے۔ جس میں پوپ یعنی مذہبی پیشوا کو مطلق العنان حاکمیت کے

اختیارات حاصل ہوتے ہیں ۔ بادشاہ شاہی تاج سر پر رکھ کر مظالم کرتا ہے اور پوپ دلق وقبا پہن کر لوگوں پر اپنی بادشاہی مسلط کرتا ہے۔" (ص:۷۱)

اسی کے تعلق سے مزید لکھتے ہیں:

"چنانچہ لوگ پاپائیت کے اسی احمقانہ اور ظالمانہ نظام کو مذہب سمجھنے لگے اور پوپ کی نفرت کے ساتھ خود مذہب کے خلاف بھی نفرت کے جراثیم پیدا ہونے لگے ۔اس نفرت کو آگے چل کر ڈارون، مارکس اور فرائیڈ جیسے لوگوں نے مزید آگے بڑھایا جس کی وجہ سے آج یورپ مادیت اور لادینیت کے سیلاب میں تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔" (ص:۷۴)

سیکولر جمہوریت یعنی ڈیموکریسی کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"اہل مغرب نے جمہوریت کا تصور عربی ڈکشنری سے نہیں لیا ہے بلکہ یونانی لفظ ڈیموکریسی سے لیا ہے جس کے معنی ہیں عوام کی حکومت یعنی عوام کی حکومت ،عوام کے ذریعے، عوام کے لیے ۔اس نظام میں معیار حق اور ماخذ قانون عوام کی مرضی اور منشاء ہوتی ہے ۔جمہور الناس مختار کل اور مقتدر اعلیٰ ہوتے ہیں اور جمہوریت مطلق العنان ہوتی ہے ۔اس نظام کے قومی اور عوامی نمائندوں کے لیے خدا، رسول، دین اور آسمانی کتابوں یا اخلاقی قدروں کی تابعداری ضروری نہیں ہوتی بلکہ عوام کی مرضی اور ان کی پسند کی تابعداری اور وفاداری لازمی ہوتی ہے گویا عوام خدا ہوتے ہیں اور عوامی نمائندے ان کے رسول ہوتے ہیں ۔" (ص:۷۶)

اسی میں مزید لکھتے ہیں:

"عوام کی حاکمیت، سیکولرازم یعنی مذہب اور سیاست کی مکمل علاحدگی، لبرل ازم یعنی بے قید اور بے لگام آزادی، کیپٹل ازم یعنی سرمایہ داری اور مادہ پرستی، نشنلزم یعنی قوم پرستی اور دوسری قوموں کا استحصال ، پارٹی سسٹم یہ تمام چیزیں ڈیموکریسی کے بنیادی اصول ہیں۔"

اشتراکیت یعنی سوشلزم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سیاست اور معاشرت کی اصطلاح میں سوشلزم کی تعریف یہ ہے :وہ نظام جس میں کسی ملک کے تمام ذرائع پیداوار کسی ایک فرد یا چند افراد کی ملکیت میں ہونے کی بجائے پورے معاشرے کی ملکیت قرار دیئے جاتے ہیں اور اس کا مقصد معاشرے اور فرد دونوں کی فلاح و بہبود اور فرد کو زندگی کی بنیادی ضروریات کی فکر سے نجات دلانا سمجھا جاتا ہے۔" (ص:۸۵)

آگے مزید لکھتے ہیں:

"مادی نظریہ حیات، خداوند قدوس کی ہستی سے انکار یعنی دہریت، مذہب اور دین سے انکار، خاندانی نظام سے انکار، شخصی ملکیت سے انکار، جدلیاتی فلسفہ اور طبقاتی کشمکش پرولتاری ڈکٹیٹر شپ یعنی مزدوروں کی آمریت ، پارٹی ڈکٹیٹر شپ، لیڈروں کی ڈکٹیٹر شپ وغیرہ اشتراکیت کے بنیادی اصول ہیں۔"

تیسرا باب خلافت ہے جو اس کتاب کا سب سے طویل باب ہے ۔خلافت کی اہمیت وافادیت کو لوگوں میں عام کرنے کی غرض سے یہ کتاب لکھی گئی ہے ۔اس باب میں کل تین فصلیں ہیں اور تیسری فصل میں حاکمیت الٰہیہ، الشوری، بیعت، شرائط الامام، وزارت اور عدلیہ پر تفصیلی بحث قرآن وسنت کی روشنی میں کی گئی ہے ۔

پہلی فصل میں "لفظ خلافت" اس کے لغوی ، اصطلاحی تعریف کا ثبوت قرآن وحدیث سے دیا گیا ہے ۔ساتھ میں خلافت کے تعلق سے ائمہ کرام ومجتہدین کے اقوال بھی نقل کیے گئے ہیں ۔

فصل ثانی میں انبیاءؑ اور صالحین کی رائے کا تذکرہ جو حکومت کے بارے میں ہے ۔اس میں حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمدؐ تک منتخب انبیاء کرام اور صالحین کی حکومت کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ مولانا حضرت یوسفؑ کی حکومت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسلامی انقلاب لانے اور اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے تین ذریعے ہو سکتے ہیں ۔

(۱) دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتربیت کے ذریعے ملک کی اکثریت خود بخود اپنی آزاد مرضی سے اپنے لیے عادل اور صالح حکمراں منتخب کرے یا اگر نبی موجود ہو تو اس کی قیادت تسلیم کرے ۔

(۲) صالحین کی معتدبہ جماعت کے ذریعے جہاد شروع کیا جائے اور جنگ کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کیا جائے ۔

(۳) یا حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ اقتدار کی تبدیلی پُر امن طور پر عمل میں آجائے ۔ یوسفؑ کے لیے اس وقت یہی تیسرا راستہ ہموار ہو گیا تھا اور آپؑ نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ (ص:۱۴۹، ۱۵۰)

موصوف حضرت محمدؐ کی خلافت و سیاست کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ دین کا غلبہ اہل دین کے غلبے پر موقوف ہے ۔فریضۂ اقامت دین کی ادائیگی

اور غلبۂ دین کے لیے تعلیم و تبلیغ اور تزکیہ و ارشاد کی کوششوں کے ساتھ اسلامی ریاست کے قیام اور حصول اقتدار کی کوشش کرنا بھی فرائض نبوت میں شامل ہے۔" (ص:۱۶۶)

مزید دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"مکے والوں کی پیش کردہ حکومت کو رسولؐ نے اس لیے رد کیا تھا کہ انھوں نے توحید کو ترک کرنے کی شرط لگائی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جاہلیت کا مشرکانہ نظام بحال رہے۔ البتہ اس کی قیادت سابقہ سرداروں کی جگہ محمدؐ اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ ظاہر ہے کہ نبیؐ کے دل میں اس قسم کی حکومت کا خیال تک نہیں آسکتا لیکن آپؐ مکہ کے سرداروں، قبائلی لیڈروں اور اپنے رشتہ داروں کو مسلسل یہ بات سمجھاتے تھے کہ اگر تم نے توحید کو قبول کرلیا اور اس کا تقاضہ بھی پورا کیا تو عرب پر تمہاری حکومت قائم ہوجائے گی اور عجم تم کو جزیہ دیں گے۔" (ص:۱۶۶، ۱۶۷)

صاحب کتاب میثاق مدینہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس تحریری منشور سے ثابت ہونے والے چند سیاسی اصول یہ ہیں:

(۱) تمام دستاویزات اور تحریریں 'بسم' سے شروع کی جائیں اس لیے کہ ریاست کا حاکم اللہ ہی ہے۔ (۲) ریاست کا قانون قرآن و سنت ہے اور اس کا سربراہ محمدؐ ہے۔ (۳) تمام شہریوں کو قانونی مساوات، مذہبی آزادی، شہری حقوق اور معاشی تحفظ حاصل ہوگا۔ (۴) ریاست کا دفاع تمام شہریوں پر لازم ہوگا اور کسی نوع کا فتنہ و فساد برداشت نہیں کیا جائے۔" (ص:۱۸۳)

تیسرے باب کی تیسری اور آخری فصل 'اسلامی نظام حکومت کے بنیادی اصول' پر ہے۔ اس میں مولانا طاغوت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ائمہ لغت اور ائمہ تفسیر کی مذکورہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ کاہن، ابلیس اور بت بھی طاغوت ہیں اور وہ حکمراں بھی طاغوت ہے جو خدا کی حاکمیت کی جگہ اپنی حاکمیت مسلط کرتا ہو اور خدا کے قوانین کی جگہ اپنے بنائے ہوئے قانون یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کو نافذ کرتا ہو اور انسان کا اپنا نفس امارہ بھی طاغوت ہے جو اسے بغاوت پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب طواغیت سے بچنے کا حکم دیا ہے۔" (ص:۲۳۰)

ایک جگہ حاکمیت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قرآن، احادیث رسول، تعامل خلفاء راشدین اور مشہور فقہاء اسلام کے اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور ماخذ قانون کتاب و سنت ہے۔ اس بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر اللہ کو حاکمیت، شارعیت اور غیر مشروط قانون سازی کے اختیارات دینا شرک فی الحکم ہے۔" (ص:۲۵۵)

صاحب مصنف نے خلیفہ کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

"اسلامی نظام میں خلیفہ روز مرہ کے عام فیصلوں کے علاوہ تمام اہم امور میں شوریٰ کا پابند ہوتا ہے اور وزراء اور دیگر کلیدی مناصب کی تقرریاں اور عزل و نصب کے فیصلے کرنا اہم ترین امور ہیں۔ اس لیے "امرھم شوری بینھم" کے شرعی قاعدے کے مطابق خلیفہ وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کی منظوری مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق دینے کا پابند ہونا چاہیے اور وزارت کو برخاست کرنے کے لیے بھی اس مجلس کی منظوری لازمی شرط ہونی چاہیے۔" (ص:۳۶۲)

ایک جگہ عدلیہ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"عدلیہ کا انتظامیہ کی بے جا مداخلت سے آزاد ہونا اور سب پر بالادست ہونا قیام عدل کی لازمی شرط ہے۔ اسلام کے نظام عدل میں عدالت صدر مملکت سے لے کر عام شہری تک اور فوج کے کمانڈر ان چیف سے لے کر ادنیٰ سپاہی تک ہر ایک کو جواب دہی کے لیے طلب بھی کرسکتی ہے اور قانون کے مطابق سزا بھی دے سکتی ہے اور عدالت کے کام میں انتظامیہ کا کوئی شخص بڑا ہو یا چھوٹا مداخلت کرنے کا حق نہیں رکھتا یہ قاضی کی بالادستی نہیں ہے بلکہ قانون کی بالادستی ہے جو خود قاضی پر بھی نافذ ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص نے خود قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) پر بھی دعویٰ کیا ہو تو دوسرا قاضی اس مقدمے کی سماعت کرے گا اور قانون کے مطابق فیصلہ دے گا۔" (ص:۴۰۰، ۴۰۱)

موضوع کے اعتبار سے کتاب اہمیت کی حامل ہے۔ مصنف نے اختصار کے ساتھ اسلام اور اسلامی سیاست کے خدوخال کو دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس لیے قاری کو مطالعہ کرتے وقت کسی بھی طرح کی پریشانی نہیں ہوتی، ہر کسی کو چاہیے کہ وہ یہ کتاب اپنی زندگی میں ایک بار ضرور پڑھے تاکہ اسلام اور اسلامی سیاست و خلافت کی بنیادی باتوں سے وہ آگاہ ہوسکے اور باطل کے چکا چوند میں احساس کمتری کا شکار ہونے سے وہ بچ سکے۔

●●●

سیرت النبیؐ: چیدہ چیدہ واقعات

مرزا اسلم

اللہ کے حبیب حضرت محمدؐ ۵۷۱ عیسوی میں دنیا میں تشریف لائے۔ نبی کریمؐ کی زندگی محیر العقول واقعات سے بھری پڑی ہے، یہ واقعات آپ کی پیدائش سے پہلے بچپن میں اور نبوت کے بعد بھی رونما ہوئے، ایسے تمام حیران کن واقعات جو کسی نبی کو نبوت ملنے سے پہلے درپیش آئیں ''ارھاصات'' کہلاتے ہیں۔

ایسا ہی ایک عجیب واقعہ نبی کریمؐ کے ساتھ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے گھر ولادت کے چوتھے یا پانچویں سال پیش آیا، جب ان کا سینہ فرشتوں نے چاک کر کے ان کا دل دھویا تھا، اسے شق صدر (سینہ مبارک چاک کیے جانے) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کا ذکر حضورؐ نے ایک مجلس میں کیا تھا جب کہ قبیلہ بنی عامر کے ایک بوڑھے شخص نے حضورؐ سے اپنی ابتدائی زندگی کے حالات سنانے کی خواہش کی تھی۔ آپؐ نے فرمایا:

میرا شیر خواری اور بچپن کا ابتدائی زمانہ بنی سعد بن بکر میں گزرا، ایک دن میں اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ سفید پوش آدمیوں (فرشتوں) کی ایک ٹولی نے جن کے ہاتھوں میں سونے کی تھالی میں (زمزم کی) برف بھری تھی، مجھے پکڑ لیا، میرے ساتھی ڈر کر بھاگ گئے، انھوں نے مجھے زمین پر لٹایا اور (میرے سینے یا پیٹ کے) اندرونی اجزا نکال کر (زمزم کی) برف (کے پانی) سے اچھی طرح دھویا اور پھر اپنی جگہ رکھ دیا، یہ منظر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، دوسرے نے میرے سینے میں ہاتھ ڈالا اور دل کو نکالا اور اس سے ایک لوتھڑا نکال کر فرمایا: ''یہ تم میں شیطان کا حصہ ہے'' پھر دل کو (سونے کی) طشت میں زمزم (کی برف) کے پانی سے دھویا، پھر اپنے ہاتھ کو فضا میں بلند کیا تو اچانک ایک نور کی مہر اس کے ہاتھوں میں آگئی، اس نے مہر دل پر لگائی تو وہ نور سے بھر گیا، پھر دل کو جوڑ کر اپنے مقام پر رکھ دیا۔ اب تیسرے نے سینے سے ناف تک ہاتھ پھیرا تو زخم مندمل ہوگیا، میں اٹھ کھڑا ہوا تو تینوں نے باری باری مجھے سینے سے لگایا اور میری پیشانی پر بوسہ دیا۔

آپؐ کے دودھ شریک بھائی نے یہ منظر دیکھا تو دوڑ کر اپنے والدین کو اطلاع دی کہ کچھ سفید پوش آدمیوں نے میرے قریشی بھائی کا پیٹ چاک کر دیا ہے، یہ سنتے ہی وہ فوراً وہاں گئے اور دیکھا کہ بچے کے چہرہ کا رنگ فق ہے، اس واقعے سے حضرت حلیمہؓ کو خطرہ محسوس ہوا، اس لیے آپؐ کو اپنی والدہ کے پاس پہنچانے کے لیے مکہ روانہ ہوگئے اور حضرت آمنہ سے سارا حال بیان کیا۔

یہ سن کر حضرت آمنہ نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، خدا کی قسم! اس پر آسیب کا کوئی اثر نہ ہوگا، بلکہ یہ بچہ تو بڑی شان والا ہے۔

نبی کریمؐ کے لیے صادق اور امین کا خطاب:

اللہ نے اپنے تمام انبیا کو ساری زندگی شرک وگمراہی اور رسوم جاہلیت سے محفوظ رکھا، چنانچہ تمام ہی انبیا کرام اپنی نبوت ورسالت سے پہلے بھی اپنے خاندان وقبیلے اور قوم کے صالح ترین انسان قرار پائے، جیسے حضرت ابراہیمؑ یا حضرت یوسفؑ کے واقعات سے ظاہر ہے۔

اسی طرح نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰؐ بھی اپنی نبوت ورسالت سے پہلے اپنے لڑکپن

اور دور جوانی میں شرک و بت پرستی اور تمام مراسم شرک سے بالکل پاک اور منزہ رہے، آپؐ کی نیکی، خوش اطواری، دیانت، امانت اور راستبازی کی اس قدر شہرت ہوگئی تھی کہ لوگ آپؐ کو نام لے کر نہیں بلکہ ''الصادق یا الامین'' کہہ کر پکارتے تھے، جیسا کہ ابن ہشام کی روایت میں ہے کہ:

پس رسولؐ اس حال میں جوان ہوئے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کی حفاظت اور نگرانی فرماتے تھے اور جاہلیت کی تمام گندگیوں سے آپؐ کو پاک اور محفوظ رکھتے تھے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہو چکا تھا کہ آپؐ کو نبوت و رسالت اور ہر قسم کی عزت و کرامت سے سرفراز فرمائے، یہاں تک کہ آپؐ مرد کامل ہوگئے اور مروت و حسن خلق، حسب و نسب، حلم و بردباری و راست بازی اور صداقت و امانت میں سب سے بڑھ گئے اور فحش و اخلاق رذیلہ (بری عادات و خصلت) سے انتہا درجے دور ہوگئے، یہاں تک کہ آپؐ و صحابہؓ ''(الصادق) الامین'' کے نام سے مشہور ہوگئے۔

حضرت زید بن حارثؓ فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں جب مشرکین مکہ بیت اللہ کا طواف کرتے تو ''اساف و نائلہ'' (دو بتوں کے نام) کو چھوتے تھے، ایک بار میں نے آپؐ کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کیا، جب ان بتوں کے پاس سے گزرا تو ان بتوں کو چھوا، آنحضرتؐ نے مجھ کو (ان بتوں کو چھونے سے) منع کیا۔

میں نے اپنے دل میں کہا کہ دیکھوں تو سہی کہ چھونے سے ہوتا کیا ہے، اس لیے دوبارہ ان کو چھوا، آپؐ نے پھر ذرا سختی سے منع کرتے ہوئے فرمایا ''کیا تم کو منع نہیں کیا تھا۔'' حضرت زیدؓ فرماتے ہیں، ''اللہ کی قسم! اس کے بعد کبھی کسی بت کو ہاتھ نہیں لگایا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا اور آپؐ پر اپنا کلام اتارا۔'' (مستدرک حاکم۔۔جلد ۳، ص ۲۱۶)

ایک مرتبہ (ایک دعوت میں) قریش نے آپؐ کے سامنے کھانا لا کر رکھا، آپؐ نے اس کو کھانے سے انکار کیا، وجہ یہ تھی کہ قریش جانوروں کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے تھے اور آپؐ کو بتوں کے چڑھاوے کھانے سے اپنی پاکیزہ طبیعت کی وجہ سے نفرت تھی۔

خلاصہ یہ کہ تمام انبیا کرام کی طرح آپؐ بھی ابتدا سے ہی نہایت صالح طبیعت والے اور کفر و شرک اور ہر قسم کے فحشا و منکر سے پاک اور منزہ تھے۔

مسز اینی بیسنٹ ہندوستان میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کی پیشوا اور بڑی مشہور انگریز عورت ہے، وہ لکھتی ہے:

پیغمبر اعظمؐ کی جس بات نے میرے دل میں ان کی عظمت و بزرگی قائم کی ہے، وہ ان کی وہ صفت ہے جس نے ان کے ہم وطنوں سے ''الامین'' (بڑا دیانت دار) کا خطاب دلوایا، کوئی صفت اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی اور کوئی بات اس سے زیادہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے قابل اتباع نہیں، ایک ذات جو مجسم صدق ہو، اس کے اشرف ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے، ایسا ہی شخص اس قابل ہے کہ پیغام حق کا حامل ہو۔

جنگ فجار اور معاہدہ حلف الفضول:

مستند روایات سے ثابت ہے کہ آپؐ کا لڑکپن اور زمانہ شباب دور جاہلیت کے تمام اکل و شرب، لہو و لعب اور دوسری تمام ناپسندیدہ اقدار سے پاک رہا، باوجود اس کے کہ عرب معاشرہ سرتاپا بدکاری اور بے حیائی میں ڈوبا ہوا تھا اور ایسے تمام بداعمال عرب معاشرے میں نہایت ہی پسند کیے جاتے تھے، اللہ نے آپؐ کی ذات پاک کو ان سے محفوظ رکھا، اس کھلی بدکاری کے ماحول میں آپؐ کے ہم عمر نوجوان جب جوانی کی خرمستیوں میں ڈوبے ہوئے تھے، آپؐ ان کے عین الٹ طریق پر اپنی راست بازی اور پاکیزگی میں مکہ کے صالح ترین انسان کے طور پر سامنے آئے۔

دوسری طرف ایسا کبھی نہ ہوا کہ آپؐ شرک و گمراہی کے کسی فعل میں شریک ہوئے ہوں، خانہ کعبہ کے طواف کے دوران جب مشرکین طرح طرح کے شیطانی اعمال و شرکیہ رسومات میں مبتلا ہوتے، آپؐ ان سب سے الگ تھلگ اپنا طواف جاری رکھتے، اس دوران نہ صرف خود ایسی بداعمالیوں اور شرک و بت پرستی سے دور رہتے، بلکہ دوسروں کو بھی ایسا کرنے سے روکتے، آپؐ اپنی قوم قریش کے اس دین پر کبھی نہیں چلے جس کو آپؐ کی قوم نے دین ابراہیمی ترک کر کے اپنا لیا تھا، اللہ نے آپؐ کو قبل بعثت ہر قسم کی بے حیائی و بدکاری سے پاک صاف رکھنے کے ساتھ ساتھ ارتکاب شرک و گمراہی سے بھی محفوظ رکھا۔

●●●

خطاب بہ جوانانِ اسلام

شارح: شیر خالد

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تُو نے
وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹُوٹا ہوا تارا

معنی: تدبّر: دوراندیشی، غور وفکر۔ گردوں: آسمان۔

تشریح: اے مسلم نوجوان! کبھی تم نے اس عظیم الشان آسمان کے بارے میں غور وخوض کیا ہے جس کا تو ایک ٹوٹا ہوا ستارا ہے۔ یعنی نہ تو تمہارے پاس اسلاف کی سی عظمت باقی ہے اور نہ ہی بلند کرداری، بلکہ تم ان سب سے عاری ہو چکے ہو۔

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبّت میں
کُچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

تشریح: اے نوجوان! تمہاری پرورش ان اسلاف کی گود میں ہوئی ہے جنھوں نے اپنے دور کی سب سے بڑی سیاسی قوت سلطنتِ ایران اور اسکی تہذیب کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ (داراDarius) ایران کا ایک طاقتور ترین بادشاہ تھا جس کو سکندر نے شکست دے کر اس کا سر قلم کر دیا تھا. لیکن وہ ایرانی سلطنت اور تہذیب کو ختم نہ کر سکا۔ اس ایرانی سلطنت اور تہذیب کا خاتمہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا جو دارا کے بعد سے چلی آ رہی تھی۔

تمدّن آفریں، خلاّقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

معنی: تمدن آفریں: سماجی نظام بنانے والا۔ خلاق: بنانے والا۔ جہاں داری: حکومت۔ شتربان: اونٹ کی لگام تھامنے والے۔

تشریح: تمہارے اسلاف وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کے لیے ایک نئی تہذیب وتمدن اور سماجی نظام کی بنیاد رکھی، اور دنیا میں علوم وفنون کو عام کیا۔ دنیا کو ایک نئی طرزِ حکومت اور قوانین سے روشناس کرایا۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے والے لوگ کون تھے، جو کبھی عرب کے ریگستانوں میں اونٹ کی لگام تھامے ہوئے چلتے تھے۔ یعنی اونٹوں کی لگام تھامنے والوں نے دنیا کو ایک نئے رخ پر چلایا ہے۔

سماں اَلْفَقْرُ فَخْرِی کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبا را

معنی: سماں: کیفیت۔ الفقر فخری: فقر میرا فخر ہے (حدیث)۔ اِمارت: حکومت۔

تشریح: ان تمام تر عظمتوں اور حکومتوں کے باوجود بھی تمہارے اسلاف نے درویشی اور فقر (بے نیازی) وسادگی کو ہی اپنا شعار اور پہچان بنایا جو کہ رسولؐ اللہ کا بھی شعار تھا۔ اور جس انسان کے پاس فقر و بے نیازی جیسا زیور اور زیبائش موجود ہو اسے پھر کسی اور قسم کی سجاوٹ، زیبائش یا آرائش کی کیا ضرورت؟

نوٹ: اس شعر کا دوسرا فارسی مصرعہ حافظ شیرازی کا ہے۔

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ مُنعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

معنی: گدائی: فقیری۔ غیور: بہت غیرت کرنے والا۔ منعم: نعمت دینے والا، مالدار۔ بخشش: انعام، مدد۔ یارا: حوصلہ، طاقت۔

تشریح: اے مسلم نوجوان! تمہارے اسلاف فقیری اور بے سروسامانی کی کیفیت میں بھی اتنے خود دار اور غیرت مند تھے کہ مالداروں اور امیروں کو اس بات کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان کو انعام واکرام سے نوازیں یا کوئی مدد کر سکیں۔ اور اگر کسی نے ایسا کرنے کی جرأت کی تو وہ اللہ والے ان سے ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔

(جاری ہے.....)

نقش دیوار

شیطان کی ساری شیطانی اسی میں تھی کہ اس نے کہا کہ میں حضرت آدم سے بہتر ہوں۔ میں کیوں ان کو سجدہ کروں؟ اس لیے نافرمانی کی جڑ اللہ کی نافرمانی نہیں تھی بلکہ اپنی ذات کا کبر تھا۔ کبر بہت بڑی خرابیوں کو جنم دیتا ہے۔ لہذا ذمہ دار حضرات کو چاہیے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو کمتر نہ جانیں بلکہ اپنے سے بہتر ہی سمجھیں۔ یہ سوچیں کہ ہم ان کے خادم بنا دیے گئے ہیں، اب انہیں لیکر چلنا ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمارا کوئی ساتھی خواہ کتنا ہی کمزور، ضعیف اور کم تر ہو، لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو، اچھی تقریر نہ کرسکتا ہو لیکن اس کے باوجود اس کے اندر کوئی نہ کوئی ایسی خوبی ضرور ہوتی ہے جس کی ہمیں قدر کرنا چاہیے۔ اس خوبی کو تلاش کرنا چاہیے اور اس کو ساتھ لیکر چلنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

خرم مراد رحمہ اللہ

NUKUSH - E - RAH

RNI Number : MAHURD/2018/7738
Postal Reg No: G/Akl Dn/258/2019-21

Order Now
CALL: 9599693655

گائیڈنس پبلیشرز کی اہم مطبوعات

gpdelhi2018@gmail.com

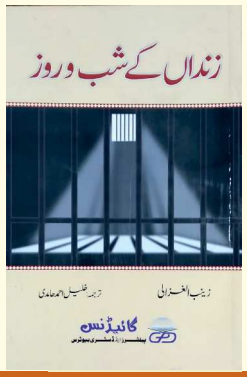

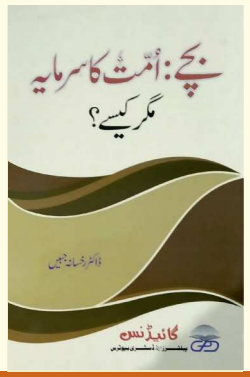

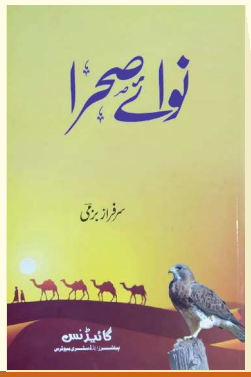

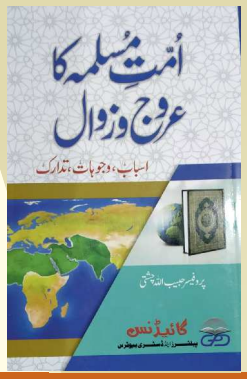

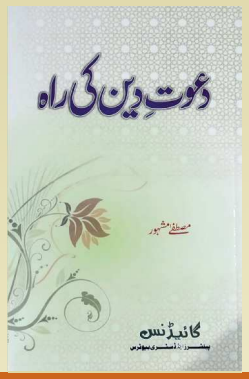

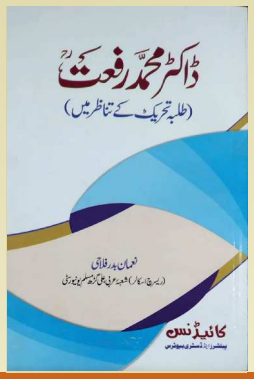

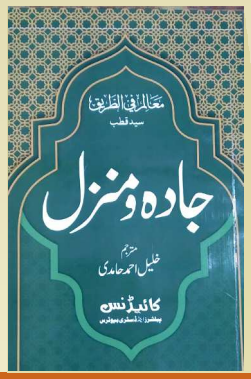

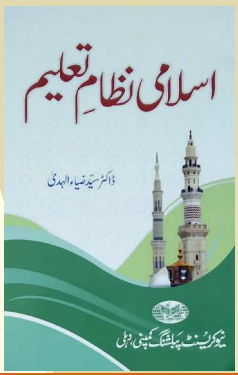

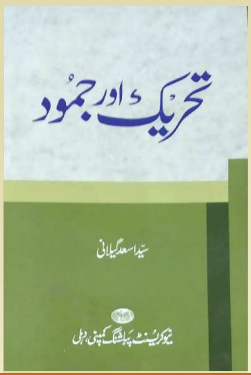

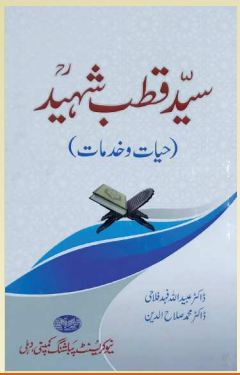

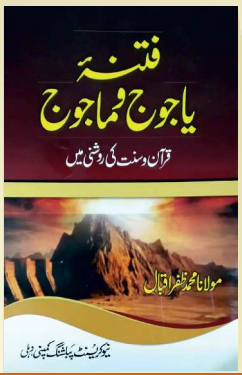

NUKUSH - E - RAH
1st Floor, Opp Basera Apartm
Subbash Chowk, Akola, 44001

0724-2434333
nukusherah@gmail.com